گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال
کے دوران دنیا بھر میں
سلامی حکومتوں کے
قیام و استحکام اور
شکست ریخت پر
ایک مستند تحقیق

مسلمانوں کا سیاسی
عروج و زوال

کیرن آرم سٹرانگ

مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال

مصنفہ: کیرن آرمسٹرانگ

مترجم: محمد احسن بٹ

نگارشات

24- مزنگ روڈ ○ لاہور ○ فون: 0092-42-7322892

E-mail:nigarshat@yahoo.com nigarshat@wol.net.pk

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال

مصنفہ: کیرن آرمسٹرانگ

مترجم: محمد احسن بٹ

ناشر: آصف جاوید

برائے نگارشات پبلشرز، 24- مزنگ روڈ، لاہور

مطبع: المطبعۃ العربیہ، لاہور

سال اشاعت: 2003ء

قیمت: -/160 روپے

فہرست

● پیش لفظ 9

● واقعات کا تاریخ وار تذکرہ 13

حصّۂ اول : شروعات 37

● رسول اللہ ﷺ (632ء۔570ء) 39

● خلفائے راشدین (661ء۔632ء) 55

● پہلا فتنہ 63

حصّۂ دوم : ارتقا 67

● اموی اور دوسرا فتنہ 69

● مذہبی تحریک 74

● امویوں کا آخری زمانہ (750ء۔705ء) 79

● عباسی: خلافتِ عظمیٰ کا دور (935ء۔750ء) 82

● باطنی تحریکیں 93

حصّۂ سوم : عروج 105

● ایک نیا نظام (1258ء۔935ء) 107

● صلیبی جنگیں 116

● توسیع 118

● منگول (1500ء۔1220ء) 120

حِصّۂ چہارم:	فاتح اسلام	133
	● شاہانہ اسلام (1500ء۔1700ء)	135
	● صفوی سلطنت	138
	● مغل سلطنت	144
	● عثمانی سلطنت	149
حِصّۂ پنجم:	الم زدہ اسلام	157
	● مغرب کی آمد (1750ء۔2000ء)	159
	● ایک جدید مسلمان ریاست کیا ہے؟	173
	● بنیاد پرستی	180
	● مسلمان اقلیت میں	191
	● آئندہ کا راستہ	194
	● اسلامی تاریخ کی کلیدی شخصیات	202
	● حواشی	221

☆☆☆

مصنفہ کا تعارف

کیرن آرمسٹرانگ (Karen Armstrong) سات برس تک ایک رومن کیتھولک نن رہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنے تجربے کو ''تنگ دروازے میں سے'' (Through The Narrow Gate) کے عنوان سے شائع ہونے والی اپنی مقبول ومعروف آپ بیتی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے ''خدا کی تاریخ'' (A History of God) کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے عالمی سطح پر شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی۔ (اس کتاب کے تراجم دنیا کی تیرہ سے زیادہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔)☆ اس کے علاوہ انہوں نے ''یروشلم کی تاریخ'' (History Of Jerusalem) اور ''خدا کے لیے جنگ'' (The Battle For God) کے عنوان سے دو مزید کتابیں تحریر کی ہیں اور حال ہی میں ''بدھ'' (BUDDHA) کے عنوان سے کتاب لکھی ہے۔ وہ لندن کے لیوبیک کالج برائے مطالعہ یہودیت میں اُستاد ہیں۔ مسلم پبلک افیئرز کونسل نے انہیں 1999ء میں میڈیا ایوارڈ سے نوازا۔

☆ کیرن آرمسٹرانگ کی اس عالمی شہرت یافتہ کتاب ''خدا کی تاریخ'' کو اردو میں ترجمہ کروا کر شائع کرنے کا اعزاز ''نگارشات'' کو حاصل ہے۔ (مترجم)

اسلام کا مستقبل

''نگارشات'' اپنے قیام کے وقت ہی سے تاریخ کے موضوع پر نادر و نایاب کتابیں اہل علم کے ذوقِ آ گہی کی نذر کرتا آیا ہے۔ زیرنظر کتاب کیرن آرمسٹرانگ کی عالمانہ تصنیف ''اسلام: اے شارٹ ہسٹری'' (Islam: A Short History) کا ترجمہ ہے۔ چونکہ فاضل مصنفہ نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ سیاسی زاویے سے کیا ہے لہٰذا ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اردو ترجمے کا عنوان ''مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال'' رکھا جائے۔

یہ کتاب اسلامی تاریخ کے جس موڑ پر اختتام پذیر ہوتی ہے' وقت اس سے بہت آ گے نکل چکا ہے اور انتہائی دوررس تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ نہ صرف افغانستان میں طالبان حکومت ختم کر دی گئی بلکہ ایک عبوری حکومت بھی قائم ہو چکی ہے' جو اس حرماں نصیب ملک میں جمہوریت کی راہیں ہموار کرے گی۔

پاکستان میں بھی اکتوبر 1999ء میں فوجی حکومت آئی اور اکتوبر 2002ء میں عام انتخابات کے بعد جمہوریت لوٹ آئی۔ ادھر ترکی میں بھی اسلام پسندوں نے اقتدار حاصل کر لیا۔ مشرق وسطیٰ میں بھی اہم پیش رفتیں ہوئیں اور ہو رہی ہیں' دیکھئے' پردۂ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے!

زیرنظر کتاب کا موضوع اسلام کی سیاسی تاریخ ہے اور اس میں مصنفہ نے ماضی کے واقعات و حالات کا تذکرہ کیا ہے تاہم اس وقت دنیا کے علمی حلقوں کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں میں بھی اسلام کے مستقبل کے حوالے سے سوالات زیر بحث ہیں۔

ان سوالات کے بے شمار جواب دیے گئے ہیں مگر سب غیراطمینان بخش ہیں اور مزید سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ ہر شخص سوچ رہا ہے کہ اسلام کا مستقبل کیا ہے؟

اسلام کا مستقبل ''جمہوریت'' ہے' اکیسویں صدی کی جمہوریت۔ رواں صدی کے

پہلے پچیس برسوں میں اسلامی ملکوں میں سیاسی منظرنامہ مکمل طور پر تبدیل ہونے کا امکان ہے...... اور اس تبدیلی کا آغاز ہو چکا ہے۔ اسلام کے زیراثر معاشروں کی قلبِ ماہیئت ہو جائے گی اور مسلمان اپنی حیات کے نئے مرحلوں میں داخل ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے بیسویں صدی میں مختلف ملکوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی طرح بہت خون خرابہ ہو۔

پرندو! دھوپ اور پانی ذخیرہ کر کے چھپ جاؤ
بہت تاریک اور آسیبی موسم آنے والا ہے

ہماری دعا ہے کہ اسلامی دنیا میں بسنے والے انسانوں کے لیے 2025ء تک کا زمانہ اللہ کے عذاب سے کم اور رحمتوں سے زیادہ معمور ہو۔ (آمین)۔

محمد احسن بٹ

پیش لفظ

کسی مذہبی روایت کی خارجی تاریخ اکثر و بیشتر عقیدے کی تخلیق کے مقصد سے الگ دکھائی دیتی ہے۔ روحانی جستجو تو ایک داخلی سفر ہوتی ہے' یہ سیاسی کی بجائے نفسیاتی ڈراما ہوتا ہے۔ اس میں حاضرہ واقعات سے تصادم کے بغیر طریقہ عبادت' عقیدے' مراقباتی ضابطے اور دل کی ایک سیاحت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذاہب روح کے باہر بھی ایک زندگی کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے رہنماؤں کو دنیا کے حالات و معاملات میں شامل ہونا پڑتا ہے اور وہ ایسا کرتے ہوئے اکثر و بیشتر لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ وہ دیگر عقیدوں کے ارکان سے لڑتے ہیں' جو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مطلق سچ پر ان کی اجارہ داری کے دعوے کو چیلنج کر رہے ہوں۔ وہ اپنے ہم مذہبوں کو بھی اس لیے سزائیں دیتے ہیں کہ وہ کسی روایت کی تعبیر مختلف انداز میں کرتے ہیں یا بدعتی عقائد کے حامل ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر پروہت' ربی' امام اور شامان بھی سیاستدانوں کی طرح دنیا دارانہ عزائم کے حامل ہوتے ہیں تاہم عمومی طور پر ان سب چیزوں کو مقدس آدرش کی توہین تصور کیا جاتا ہے۔ یہ قوت و اقتدار کی کشمکش مذہب کا حقیقی مطمع نظر نہیں ہوتی بلکہ پاگل کر دینے والے ہجوم سے دور' نہ دکھائی دینے والی' خاموش اور خواہ مخواہ سر پر سوار نہ ہونے والی روح کی زندگی سے ایک پست انحراف ہوتی ہے۔ درحقیقت بہت سے عقیدوں میں درویش اور صوفیا اپنے آپ کو دنیا سے کنارہ کش کر لیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تاریخ کے شور شرابے اور جہد و کاوش کو سچی مذہبی زندگی سے غیر ہم آہنگ تصور کیا جاتا ہے۔

ہندو روایت میں تاریخ کو جلد فنا ہو جانے والی' غیر اہم اور غیر حقیقی تصور کرتے ہوئے رد کر دیا گیا ہے۔ قدیم یونان کے فلسفی ان ابدی قوانین پر غور و فکر کرتے تھے جو کہ تغیر پذیر خارجی حالات کی بنیاد ہوتے ہیں جبکہ خود یہ تغیر پذیر خارجی حالات کسی سنجیدہ مفکر کے لیے حقیقی دلچسپی کے حامل نہیں ہو سکتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ اکثر و بیشتر اپنی حکایات میں اپنے پیروکاروں پر یہ واضح کرنے کے لیے غیر معمولی انداز اپنا لیتے تھے کہ ان کی سلطنت یہ دنیا نہیں

ہے بلکہ اسے تو صرف ماننے والے کے داخل ہی میں پایا جا سکتا ہے۔ یہ سلطنت کسی زبردست سیاسی باجے گاجے سے حاصل نہیں ہوگی بلکہ رائی کے اگتے ہوئے بیج کی طرح خاموشی سے اور غیر محسوس انداز میں ارتقا پائے گی۔ جدید مغرب میں ہم مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا اصول اختیار کر چکے ہیں۔ اس سیکولر پن کی اساس روشن خیالی کے دور کے فلسفوں پر ہے۔ اس کا مقصد مذہب کو سیاسی معاملات کی بدعنوانیوں سے نجات دلانا اور اس کے زیادہ سچائی کے ساتھ اپنا ہونے کی راہ کشادہ کرنا تھا۔

لیکن خواہ مذہبی لوگوں کی تمنائیں روحانی ہی ہوتی ہوں انہیں خدا یا مقدس ہستی کو اس دنیا میں ہی ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ معاشرے پر اپنے آدرشوں کا اطلاق ان کا فرض ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ اپنے آپ کو گوشہ نشیں کر لیں تب بھی وہ اپنے زمانے ہی کے مرد اور خواتین ہوتے ہیں اور خانقاہ کے باہر رونما ہونے والے واقعات و حالات سے متاثر ہوتے ہیں تاہم انہیں اس کا مکمل ادراک نہیں ہوتا۔ جنگیں، طاعون، قحط، معاشی بدحالی اور ان کی قوم کی داخلی سیاست ان کی گوشہ نشیں ہستی پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی مذہبی بصیرت کو مستند بنا دیتی ہیں۔ درحقیقت تاریخی المیے ہی اکثر لوگوں کو روحانی جدوجہد کے لیے تحریک دیتے ہیں تاکہ وہ خام، عارضی اور بے روح واقعات کے ایک تسلسل میں کوئی حتمی معنویت ڈھونڈیں۔ چنانچہ تاریخ اور مذہب لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ بدھ نے کہا تھا کہ ہمارا یہ احساس کہ ہستی خام ہے، ہمیں ایک ایسے متبادل کی تلاش پر مجبور کرتا ہے جو کہ ہمیں مایوسی و ناامیدی میں مبتلا ہونے سے محفوظ و مامون رکھے۔

شاید مذہبی زندگی کا مرکزی استبعاد (پیراڈوکس) یہ ہے کہ یہ ہستی کی اس جہت یعنی ماورائیت کو ڈھونڈتی ہے جو ہماری دنیاوی زندگیوں سے برتر ہوتی ہے، مگر انسان اس ماورائی حقیقت کا تجربہ صرف ارضی، طبعی مظہر میں ہی کر سکتے ہیں۔ لوگ الوہی ہستی کو چٹانوں، پہاڑوں، معبدوں کی عمارتوں، قانونی ضابطوں، تحریری متنوں یا دوسرے مردوں اور عورتوں میں محسوس کر چکے ہیں۔ ہم ماورائیت کا تجربہ کبھی براہ راست نہیں کرتے یعنی ہماری مسرت ہمیشہ ''ارضی'' ہوتی ہے اور یہاں نیچے ہی کسی شے یا کسی شخص سے وابستہ ہوتی ہے۔ مذہبی لوگوں کو ناقابلِ اعتبار سطح کے نیچے دیکھنے کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ اس میں مقدس ہستی کو ڈھونڈیں۔ انہیں

اپنے تخلیقی تخیلات کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ژاں پال سارتر تخیل کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ اس شے کے بارے میں غور وفکر کرنے کی اہلیت ہوتی ہے جو حاضر و موجود نہیں ہوتی۔ انسان اس لیے مذہبی ہوتے ہیں کیونکہ وہ تخیل رکھتے ہیں۔ ان کو تخلیق ہی اس انداز سے کیا گیا ہے کہ وہ پوشیدہ معانی کی تلاش اور ایک ایسی مسرت کے حصول پر مجبور ہیں جو انہیں احساس دلائے کہ وہ کاملاً زندہ ہیں۔ ہر روایت اپنے وفاداروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ کسی زمینی علامت پر توجہ مرکوز کریں جو کہ خاص الخاص اسی کی علامت ہوتی ہے اور انہیں اس علامت کے اندر الوہی ہستی کو دیکھنے کا درس دیتی ہے۔

اسلام میں مسلمانوں نے اللہ کو تاریخ میں دیکھا ہے۔ ان کی مقدس کتاب قرآن نے انہیں ایک تاریخی مقصد (مشن) سونپا ہے۔ ان کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ ایسی عادلانہ برادری تخلیق کریں جس کے تمام افراد حتیٰ کہ انتہائی کمزور اور بے بس لوگوں سے بھی مطلق احترام واکرام کے ساتھ برتاؤ کیا جائے۔ ایک ایسے معاشرے کو قائم کرنے اور اس میں جینے کا تجربہ انہیں الوہی ہستی سے آشنا کروائے گا کیونکہ وہ اللہ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ ایک مسلمان کو تاریخ کے ساتھ قول نبھانا پڑتا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ ریاست کے معاملات روحانیت سے الگ نہیں تھے بلکہ بذاتِ خود مذہب کا حصہ تھے۔ مسلمان برادری کی سیاسی بہبود ایک سب سے زیادہ اہمیت کا حامل معاملہ تھا۔ کسی بھی مذہبی مثالیے (آئیڈیل) کے مانند تاریخ کے خراب اور الم ناک حالات میں اس کا نفاذ بھی ناممکن حد تک مشکل تھا تاہم ہر ناکامی کے بعد مسلمانوں کو اٹھنا اور دوبارہ آغاز کرنا ہوتا تھا۔

مسلمانوں نے ہر کسی کی طرح اپنی رسومات، تصوف، فلسفہ، عقیدے، قوانین اور مزارات بنائے۔ تاہم یہ سب کی سب مذہبی مہمات اسلامی معاشرے کے سیاسی حالاتِ حاضرہ پر مسلسل مضطربانہ غور وفکر سے بلاواسطہ ابھری ہیں۔ اگر ریاستی ادارے قرآنی مثالئے پر پورا نہیں اترے، اگر ان کے سیاسی رہنما بے رحم یا استحصال کرنے والے تھے یا اگر ان کی برادری کو کسی بظاہر غیر مذہبی دشمن نے زیر کرلیا تھا تو کوئی بھی مسلمان محسوس کرسکتا تھا کہ اس کا زندگی کے حتمی مقصد اور قدر پر ایمان خطرے میں ہے۔ اسلامی تاریخ کو واپس راستے پر لانے کے لیے ہر کوشش کرنی پڑتی تھی ورنہ مکمل مذہبی ادارہ ہی ناکام ہوکر رہ جاتا اور زندگی معنویت

سے عاری ہوگئی ہوتی۔ چنانچہ سیاست، جسے عیسائی عشائے ربانی کہا کرتے تھے، ایک ایسا میدانِ عمل تھی جس میں مسلمان اللہ کی معرفت حاصل کرتے تھے اور جو الوہی ہستی کو دنیا میں عمل کرنے کے قابل بناتی تھی۔ نتیجتاً مسلمان برادری کے تاریخی رنج و آلام اور آزمائشوں ......سیاسی قتل، خانہ جنگیوں، یورشوں اور حکمران خانوادوں کے عروج و زوال ......کو داخلی مذہبی جستجو سے الگ نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ اسلامی بصیرت کا جوہر تھے۔ پوشیدہ الوہی مغز (Kernel) کو دریافت کرنے کے لیے تخلیقی تخیل کو استعمال کرتے ہوئے ایک عیسائی کسی دیوار پر بنی ہوئی شبیہہ پر مراقبہ کیا کرتا تھا جبکہ ایک مسلمان اپنے زمانے کے موجودہ واقعات اور ماضی کی تاریخ پر توجہ مرکوز کرتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی خارجی تاریخ کا بیان محض ثانوی دلچسپی کا حامل نہیں ہوسکتا کیونکہ تاریخ کو تقدس دینا اسلام کا ایک بنیادی وصف رہا ہے۔

✿ ✿ ✿ ✿

واقعات کا تاریخ وار تذکرہ

610ء: حضرت محمد ﷺ پر مکہ میں قرآن کی پہلی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے دو برس بعد آپ ﷺ تبلیغ کا آغاز فرماتے ہیں۔

616ء: حضرت محمد ﷺ کے پیروکاروں اور مکہ کے سرداروں (Establishment) کے درمیان تعلقات شکست و ریخت سے دوچار ہوجاتے ہیں اور ظلم و ستم کا سلسلہ جاری ہوجاتا ہے۔

620ء: یثرب (جسے بعد میں مدینہ کہا جانے لگا) کے عربوں نے حضرت محمد ﷺ سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی برادری (کمیونٹی) کی رہنمائی کرنے کی دعوت دی۔

622ء: کوئی ستر کے لگ بھگ مسلمان خاندانوں کے ہمراہ رسول کریم ﷺ مکہ سے مدینہ ہجرت کرجاتے ہیں اور مکہ کے سرداران سے انتقام لینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہجرت سے سن ہجری (MUSLIM ERA) کا آغاز ہوتا ہے۔

624ء: مسلمان جنگِ بدر میں مکہ والوں کو ایک عبرتناک شکست سے دوچار کردیتے ہیں۔

625ء: مسلمانوں کو مدینہ کے باہر احد کی جنگ میں مکہ والوں کی فوج کے ہاتھوں شکست ہوجاتی ہے۔

یہودی قبیلوں بنو قینقاع اور بنو نضیر کو مکہ والوں کے ساتھ سازباز کرنے پر مدینہ سے نکال دیا جاتا ہے۔

627ء: مسلمان جنگِ خندق میں مکہ والوں کی فوج کو شکستِ فاش دیتے ہیں۔

628ء: حضرت محمد ﷺ کی طرف سے امن کے لیے جرأت مندانہ پہل کے نتیجے میں مکہ اور مدینہ کے مابین معاہدۂ حدیبیہ عمل میں آتا ہے۔ اب انہیں عرب کے سب سے زیادہ طاقتور انسان کی حیثیت سے دیکھا جانے لگتا ہے اور بہت سے عرب قبائل آپؐ کی اطاعت قبول کرلیتے ہیں۔

630ء: مکہ والے معاہدۂ حدیبیہ کو توڑ دیتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ مسلمانوں اور اتحادی قبائل

کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مکہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں۔ مکہ اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہے اور حضرت محمد ﷺ کے لیے رضا کارانہ طور پر پھاٹک کھول دیئے جاتے ہیں' جو بغیر خون بہائے اور بغیر کسی کو جبری طور پر اسلام قبول کروائے شہر کو حاصل کر لیتے ہیں۔

632ء: رسول کریم حضرت محمد ﷺ وصال فرما جاتے ہیں۔
حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کا خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے۔

632-4ء: حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو نہ ماننے والے اور مرتد قبیلوں کے خلاف جنگیں۔
حضرت ابوبکرؓ بغاوت پر قابو پانے اور عرب کے سارے قبیلوں کو متحد کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔

634-44ء: حضرت عمر ابن الخطابؓ کی خلافت۔
مسلمان افواج عراق' شام اور مصر پر حملہ کرتی ہیں۔

638ء: مسلمان یروشلم کو فتح کر لیتے ہیں' جو اسلامی دنیا میں مکہ اور مدینہ کے بعد تیسرا مقدس ترین شہر بن جاتا ہے۔

641ء: مسلمان شام' فلسطین اور مصر کو فتح کر لیتے ہیں۔ وہ سلطنتِ فارس کو شکست دے چکے ہیں اور جب افرادی قوت میسر ہو گی تو وہ اس کے تمام علاقوں کو بھی زیرنگیں کر لیں گے۔
مسلمان فوجیوں کے رہنے کے لیے کوفہ' بصرہ اور فسطاط کے فوجی قصبے تعمیر کیے جاتے ہیں۔ مسلمان فوجی مفتوحہ آبادی سے الگ رہتے ہیں۔

644ء: حضرت عمرؓ کو فارس کا ایک جنگی قیدی شہید کر دیتا ہے۔
حضرت عثمان ابنِ عفانؓ کو تیسرا خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے۔

644-50ء: مسلمان قبرص اور شمالی افریقہ میں تریپولی کو فتح کر لیتے ہیں اور ایران' افغانستان اور سندھ میں اسلامی حکومت قائم کرتے ہیں۔

656ء: کچھ لوگ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے۔

656-60ء: پہلا فتنہ۔ خانہ جنگی چھڑ جاتی ہے۔

656ء: جنگِ جمل۔ رسول کریم ﷺ کی زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہؓ' حضرت

طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا بدلہ نہ لینے پر حضرت علیؓ کے خلاف ایک لشکر کی قیادت کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے ساتھی انہیں شکست دے دیتے ہیں۔

شام میں حضرت عثمانؓ کے رشتہ دار حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ حزبِ اختلاف کی قیادت کرتے ہیں۔

657ء: دونوں فریقوں کے مابین صفین میں ثالثی کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف ہوتا ہے تو حضرت معاویہؓ انہیں معزول قرار دیتے ہیں اور یروشلم میں اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔

خارجی حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

661ء: حضرت علیؓ کو ایک خارجی انتہا پسند شہید کر دیتا ہے۔

حضرت علیؓ کے حامی ان کے بیٹے حضرت حسنؓ کے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تاہم حضرت حسنؓ کا حضرت معاویہؓ کے ساتھ معاہدہ ہو جاتا ہے اور وہ مدینہ واپس چلے جاتے ہیں۔

661-80ء: حضرت معاویہؓ اوّل کی خلافت۔ وہ اموی عہدِ حکومت کی بنیاد رکھتے ہیں اور اپنا دارالحکومت مدینہ سے دمشق منتقل کر لیتے ہیں۔

669ء: مدینہ میں حضرت حسنؓ ابن علیؓ وفات پا جاتے ہیں۔

680ء: یزید اوّل اپنے والد حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد دوسرا اموی خلیفہ بن جاتا ہے۔

680-92ء: دوسرا فتنہ۔ ایک اور خانہ جنگی پھوٹ پڑتی ہے۔

680ء: کوفہ کے مسلمان، جو اپنے آپ کو شیعہ ٔ علیؓ کہتے ہیں، حضرت علیؓ ابن طالب کے دوسرے بیٹے حضرت حسینؓ کے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حضرت حسینؓ ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ کوفہ روانہ ہوتے ہیں اور یزید کے فوجی انہیں کربلا کے میدان میں شہید کر دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ عرب میں یزید کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔

683ء: یزید اول وفات پا جاتا ہے۔

اس کا بیٹا معاویہ ثانی طفلی ہی میں فوت ہو جاتا ہے۔

مروان اول کی جانشینی' جو خلافت کا اموی دعویدار ہوتا ہے اور شامی اس کی حمایت کرتے ہیں۔

684ء: خارجی باغی وسطی عرب میں امویوں کی مخالفت میں ایک آزاد ریاست قائم کرتے ہیں۔
عراق اور ایران میں خارجی بغاوت کر دیتے ہیں۔
کوفہ میں شیعہ تقویت پا لیتے ہیں۔

685ء۔705ء: عبدالملک کی خلافت' جو اموی حکمرانی کو بحال کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

691ء: اموی افواج خوارج اور شیعہ باغیوں کو شکست دیتی ہیں۔
یروشلم میں گنبد صخریٰ مکمل ہو جاتا ہے۔

692ء: اموی افواج ابن الزبیرؓ کو شکست دیتی ہیں اور انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔
فتنہ جنگوں کے نتیجے کے طور پر بصرہ' مدینہ اور کوفہ میں ایک مذہبی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ بہت سے مکاتبِ فکر سرکاری اور نجی زندگی میں قرآن کے بھرپور اطلاق کے لیے مہم چلاتے ہیں۔

705-15ء: الولید کی خلافت۔
مسلمان افواج شمالی افریقہ میں فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتی ہیں اور سپین میں سلطنت قائم کرتی ہیں۔

717-20ء: عمر ثانی کی خلافت۔ پہلے خلیفہ جو تبدیلیٔ مذہب کر کے اسلام قبول کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ مذہبی تحریک کے کچھ مثالیوں (آئیڈیلز) کے اطلاق کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

720-24ء: یزید ثانی' ایک عیاش و بدچلن حکمران کی خلافت۔ اموی حکومت کے حوالے سے شیعہ اور خوارج کا عدم اطمینان وسیع پیمانے پر نمودار ہوتا ہے۔

724-43ء: ہشام اوّل' ایک پرخلوص مگر زیادہ آمر حکمران کی خلافت' جو زیادہ نیک مسلمانوں کو بھی دشمن بنا لیتا ہے۔

728ء: حدیث کے عالم' مذہبی مصلح اور صوفی حسن البصریؒ کی وفات۔

732ء: پوائٹیرز کی جنگ۔ چارلس مارٹل سپین کے مسلمانوں کی ایک چھوٹی حملہ آور جماعت

کوشکست دیتا ہے۔
امام ابوحنیفہؒ فقہ کے مطالعے کی بنیاد رکھتے ہیں۔
محمد ابن اسحاق رسول کریم حضرت محمد ﷺ کی پہلی بھرپور سوانح حیات لکھتے ہیں۔

743-4: عباسی شیعوں کے جھنڈے تلے لڑتے ہوئے ایران میں امویوں کے خلاف بغاوت کر لیتے ہیں۔

743ء: ولید ثانی کی خلافت۔

744-9ء: مروان ثانی خلافت حاصل کر لیتا ہے اور باغیوں کے خلاف اموی بالادستی کو بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی شامی افواج چند شیعی بغاوتوں کو دبا دیتی ہیں لیکن:

749ء: عباسی کوفہ کو فتح کر لیتے ہیں اور امویوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیتے ہیں۔

750-54ء: پہلا عباسی خلیفہ ابوالعباس السفاح اموی خاندان کے سارے افراد کو قتل کروا دیتا ہے۔ یہ مطلق بادشاہت کا ایک نشان ہے' جو اسلام میں نیا ہوتا ہے۔

755-75ء: ابوجعفر المنصور کی خلافت۔ وہ ممتاز شیعوں کو قتل کروا دیتا ہے۔

756ء: سپین میں اموی پناہ گزینوں میں سے ایک اموی ایک آزاد سلطنت قائم کرتے ہوئے عباسی خلافت سے نکل جاتا ہے۔

762ء: بغداد کی تعمیر' جو نیا عباسی دارالخلافہ بن جاتا ہے۔

765ء: شیعوں کے چھٹے امام جعفر الصادقؒ کی وفات' جو اپنے پیروکاروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اصولوں کی بنیاد پر سیاست سے کنارہ کش ہو جائیں۔

769ء: اسلامی قانون کے عظیم مکاتب میں سے پہلے مکتب کے بانی امام ابوحنیفہؒ وفات پا جاتے ہیں۔

775-85ء: المہدی کی خلافت۔ وہ فقہ کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے' مذہبی تحریک کے تقویٰ کو تسلیم کرتا ہے' جو بتدریج عباسی عہد حکومت کی مطلقیت پسندی کے ساتھ بقائے باہمی سیکھ جاتی ہے۔

809ء-786ء: ہارون الرشید کی خلافت۔ عباسی قوت و اقتدار کا نقطۂ عروج۔ بغداد اور سلطنت کے دوسرے شہروں میں ایک عظیم ثقافتی نشاۃ ثانیہ برپا ہوتی ہے۔ علم' سائنس اور فنون کے علاوہ خلیفہ فقہ کے مطالعے اور احادیث کی تدوین کی حوصلہ افزائی کرتا ہے

جو اسلامی قانون (شریعت) کی ایک مربوط ہیئت کی تشکیل کو ممکن بنا دے گی۔

795ء: مالکی فقہی مکتب کے بانی امام مالکؒ ابن انس کی وفات۔

801ء: پہلی عظیم خاتون صوفی حضرت رابعہؒ کی وفات۔☆

809-13ء: ہارون الرشید کے دو بیٹوں المامون اور الامین کے مابین خانہ جنگی۔ المامون اپنے بھائی کو شکست دے دیتا ہے۔

813-33ء: المامون کی خلافت۔

814-15ء: بصرہ میں ایک شیعی بغاوت۔

خراسان میں ایک خارجی بغاوت۔

خلیفہ' جو ایک دانشور اور علوم وفنون کا سرپرست ہے' معتزلہ کی عقلیت پسندانہ الٰہیات کی طرف مائل ہو جاتا ہے' جو اب تک ناپسندیدہ رہے ہوتے ہیں۔ خلیفہ چند مخالف مذہبی گروہوں کی خوشنودی کے ذریعے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

817ء: المامون شیعوں کے آٹھویں امام الرضاؒ کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے۔

818ء: امامؒ الرضا وفات پا جاتے ہیں' ممکن ہے کہ انہیں قتل کیا گیا ہو۔

ریاست کی سرپرستی میں زیادہ مقبولِ عام اہل الحدیث' جو اپنے عقائد کی وجہ سے قید میں تھے' کے نظریات کے مقابلے میں معتزلہ کے نظریات کو ترویج دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔

833-42ء: المعتصم کی خلافت۔ خلیفہ ترک غلام سپاہیوں کا ایک ذاتی دستہ تشکیل دیتا ہے اور دارالخلافہ کو سامرہ منتقل کر لیتا ہے۔

842-7ء: الواثق کی خلافت۔

847-61ء: المتوکل کی خلافت۔

848ء: شیعوں کے دسویں امام علی الہادیؒ کو سامرہ میں عسکری قلعہ میں قید کر دیا جاتا ہے۔

855ء: اہل الحدیث کے ایک رہنما اور فقہ کے حنبلی مکتب کے بانی امام احمد ابن حنبلؒ کی وفات۔

☆ جو قارئین حضرت رابعہؒ اور دیگر ممتاز اسلامی خواتین کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں وہ ''نگارشات'' کی شائع کردہ کتاب ''نامور اسلامی خواتین'' سے استفادہ کریں۔ (مترجم)

2-861ء: المنتصر کی خلافت۔
6-862ء: المستعین کی خلافت۔
9-866ء: المعتز کی خلافت۔
868ء: شیعوں کے دسویں امام کی وفات۔ ان کے بیٹے حسن العسکریؒ سامرہ میں قید ہوتے ہیں۔
70-869ء: المہتدی کی خلافت۔
870ء: پہلے مسلمان فیلسفوف یعقوب ابن اسحاق الکندی کی وفات۔
92-870ء: المعتمد کی خلافت۔
874ء: شیعوں کے گیارہویں امام سامرہ میں قید کے دوران وفات پا جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بیٹے ابوالقاسم محمد اپنی جان بچانے کے لیے غیبت میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں امام غائب کہا جاتا ہے۔
ابتدائی ''وحدت الوجودی صوفی'' ابویزید البسطامی کی وفات۔
892ء 902ء: المعتضد کی خلافت۔
8-902ء: المکتفی کی خلافت۔
932-908ء: المقتدر کی خلافت۔
909ء: شیعہ فاطمی افریقہ، تیونس میں اقتدار پر قبضہ کر لیتے ہیں۔
910ء: پہلے ''وحدت الشہودی صوفی'' جنید بغدادیؒ کی وفات۔
922ء: ''وحدت الوجودی صوفی'' حسین المنصور کو، جو الحلاج یعنی اون دھنکنے والا کے نام سے جانے جاتے ہیں، بنیادی عقائد کی توہین کے الزامات کے تحت موت کی سزا دی جاتی ہے۔
923ء: تاریخ نویس ابوجعفر الطبری بغداد میں وفات پا جاتے ہیں۔
4-932ء: القاہر کی خلافت۔
40-934ء: الراضی کی خلافت۔
934ء: امام غائب کی عالم غیب میں امامت کا اعلان کیا جاتا ہے۔
935ء: فلسفی حسن الاشعری کی وفات۔
اس مرحلے سے خلفاء دنیوی اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور ان کا اقتدار علامتی

حد تک باقی رہ جاتا ہے۔ اب حقیقی اقتدار مقامی حکمرانوں کو حاصل ہو جاتا ہے' جنہوں نے سلطنت کے مختلف حصوں میں حکومتیں قائم کر لی ہوتی ہیں۔ تاہم ان میں سے اکثر عباسی خلفاء کی فرماں روائی کو تسلیم کرتے ہیں۔ دسویں صدی کے ان مقامی حکمرانوں میں سے بہت سے حکمران شیعی رجحانات کے حامل ہوتے ہیں۔

999ء۔874ء: سامانی:

یہ سنی ایرانی سلسلۂ حکومت ہے' جو خراسان' رے' کرمان اور ماورالنہر پر حکمران ہوتے ہیں' ان کا دارالخلافہ بخارا ہوتا ہے۔ ثمرقند فارسی ادبی نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم ثقافتی مرکز بن جاتا ہے۔ سامانی 990ء کی دہائی میں دریائے جیحوں کے مشرق میں قراخانی ترکوں اور مغرب میں غزنویوں کے آگے قوت واقتدار کھونے لگتے ہیں۔

الاندلس کی ہسپینی سلطنت

912-61ء: ایک حاکم مطلق خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کی حکومت۔

1027ء۔969ء: قرطبہ ـــ علم کا مرکز۔

1010ء: مرکزی اقتدار کمزور پڑ جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے امیر مقامی حکومتیں قائم کر لیتے ہیں۔

1064ء: شاعر' وزیر اور الٰہیات داں ابن حزم کی وفات۔

1085ء: عیسائی افواج طلیطلہ کو فتح کر لیتی ہیں۔

929-1003ء: حمدانی: عرب قبائلی حلب اور موصل پر حکومت کرتے ہیں۔ دربار عالموں' تاریخ دانوں' شاعروں اور فیلسوفوں کی سرپرستی کرتا ہے۔

950ء۔ حلب میں فیلسوف اور درباری موسیقار ابونصر الفارابی کی وفات۔

(1030ء۔930ء) بویہ:

950ء: ایران کے بارہ امامی شیعہ اور دیلم کے کوہ نشین 930ء کی دہائی کے دوران مغربی ایران میں زور پکڑنا شروع کرتے ہیں۔

945ء: بویہ بغداد' جنوبی عراق اور اومان میں زور پکڑتے ہیں۔

شیراز کے مقابلے میں بغداد اپنی امتیازی حیثیت کھونا شروع ہو جاتا ہے' جبکہ شیراز

علم کا ایک مرکز بننے لگتا ہے۔

983ء: بُو یہ کا اتحاد ٹوٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ آخر کار محمود غزنوی کے ہاتھوں انہیں رے میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑتا ہے (1030ء) اور مغربی ایران کی سطح مرتفع کے علاقوں میں بھی غزنویوں ہی کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑتی ہے۔

935-69ء: اِخشید یہ:

ترک نژاد محمد ابن طفج اِخشید یہ کی بنیاد رکھتا ہے' جو مصر' شام اور حجاز پر حکومت کرتے ہیں۔

1171ء-969ء: شیعہ فاطمی:

(بنیادی طور پر 909ء میں تیونس میں ان کی حکمرانی قائم ہوتی ہے) یہ شمالی افریقہ' مصر اور شامی علاقوں میں متوازی خلافت قائم کر لیتے ہیں۔

972ء: فاطمی اپنا دارالخلافہ قاہرہ منتقل کر لیتے ہیں جو شیعی علم کا ایک مرکز بن جاتا ہے۔ فاطمی قاہرہ میں الازہر کا مدرسہ قائم کرتے ہیں۔

1118ء۔976ء: غزنوی:

1030ء۔999ء: محمود غزنوی شمالی ہندوستان پر مستقل حکومت قائم کر لیتا ہے اور ایران میں سامانیوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیتا ہے۔

1037ء: عظیم فیلسوف ابن سینا (جنہیں مغرب میں Avicenna کہا جاتا ہے) ہمدان میں وفات پا جاتے ہیں۔

1118ء۔990ء: سلجوقی سلطنت:

990ء کی دہائی: وسطی ایشیا سے تعلق رکھنے والا سلجوقی ترک خاندان اسلام قبول کر لیتا ہے۔ گیارہویں صدی کے آغاز میں وہ اپنی خانہ بدوش گھڑسوار فوج کے ساتھ ماورالنہر اور خوارزم میں داخل ہو جاتے ہیں۔

1030ء کی دہائی: سلجوقی خراسان پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

1040ء: وہ غزنویوں سے مغربی ایران حاصل کر لیتے ہیں اور آذربائیجان میں داخل ہو

جاتے ہیں۔

1055ء: سلطان طغرل بیگ عباسی خلفاء کے نمائندہ کے طور پر بغداد سے سلجوقی سلطنت پر حکومت کرتا ہے۔

1063-73ء: سلطان الپ ارسلان کی حکومت۔

1065-7ء: بغداد میں مدرسۂ نظامیہ قائم کیا جاتا ہے۔

1073-92ء: ملک شاہ سلطنت پر حکومت کرتا ہے' نظام الملک وزیر ہوتا ہے۔
ترک فوجیں شام اور اناطولیہ میں داخل ہو جاتی ہیں۔

1071ء: سلجوق فوجیں مینزیکرٹ کی جنگ میں بازنطینیوں کو شکست دے دیتی ہیں' سلجوقی اپنے آپ کو اناطولیہ میں مستحکم کرتے ہیں اور بحر ایجئین تک پہنچ جاتے ہیں (1080ء)۔
سلجوقیوں کی فاطمیوں اور شام کے مقامی حکمرانوں سے جنگیں ہوتی ہیں۔

1094ء: بازنطینی بادشاہ الیکسیئس کومنیس اوّل اپنے علاقوں پر سلجوقیوں کے حملوں کے خلاف مغربی عیسائیت سے مدد مانگتا ہے۔

1095ء: پوپ اربن دوم پہلی صلیبی جنگ کا پرچار کرتا ہے۔

1099ء: صلیبی جنگجو یروشلم کو فتح کر لیتے ہیں۔
صلیبی جنگجو فلسطین' اناطولیہ اور شام میں چار صلیبی ریاستیں قائم کرتے ہیں۔

1090ء کی دہائی: اسمٰعیلی سلجوق اور سنی تسلط کے خلاف بغاوت کا آغاز کرتے ہیں۔ سلطنت کے مختلف حصوں میں مقامی ترک حکومتیں قائم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

1111ء: بغداد میں الہٰیات داں اور فقیہہ ابوحامد الغزالیؒ وفات پا جاتے ہیں۔

1118ء: سلجوقی سلطنت ٹوٹ کر آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

1118-1258ء: چھوٹی چھوٹی حکومتیں عباسی خلافت کو تسلیم کرتے ہوئے آزادانہ عمل کرتی ہیں تاہم عملی طور پر وہ صرف قریبی حکمران اعلیٰ تر طاقت کی اطاعت کرتی ہیں۔
نمایاں مثالیں ہیں:

1127-73ء: زنگی خاندان' جس کا بانی ایک سلجوق کمان دار تھا۔ وہ صلیبیوں کے خلاف شام میں ایک لشکر اکٹھا کرنے سے آغاز کرتا ہے۔

1130-1269ء: سنی حکمرانوں کا ایک خانوادہ الموحدین امام الغزالیؒ کے اصولوں کے مطابق

شمالی افریقہ اور سپین میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔

1150-1220ء: شمال مغربی ماورالنہر کا خوارزم شاہ ایران میں باقی ماندہ چھوٹی سلجوق حکومتوں کو شکست دیتا ہے۔

1171-1250ء: کرد جرنیل صلاح الدین کا قائم کردہ ایوبی خاندان صلیبیوں کے خلاف زنگیوں کی مہم کو جاری رکھتا ہے، مصر میں فاطمی خلافت کو شکست دیتا ہے اور وہاں سنی عقاید کو رائج کرتا ہے۔

1180-1225ء: بغداد میں عباسی خلیفہ الناصر زیادہ مؤثر حکمرانی کے لیے فتوؤں کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

1187ء: صلاح الدین حطین کی جنگ میں صلیبیوں کو شکست دیتا ہے اور یروشلم مسلمانوں کو دوبارہ مل جاتا ہے۔

1191ء: صوفی اور فلسفی یحییٰ سہروردی حلب میں انتقال کر جاتے ہیں، ممکنہ طور پر انہیں ایوبیوں نے بدعت کی وجہ سے سزا دی ہوتی ہے۔

1193ء: ایرانی نژاد غوری دہلی کو حاصل کر لیتے ہیں اور ہندوستان پر حکومت قائم کرتے ہیں۔

1198ء: قرطبہ میں فیلسفوف ابن رشد (جنہیں مغرب Averroes کے نام سے جانتا ہے) وفات پا جاتے ہیں۔

1199-1220ء: علاء الدین محمود خوارزم شاہ ایک عظیم ایرانی بادشاہت کے قیام کا فیصلہ کرتا ہے۔

1205-87ء: ہندوستان میں ایک ترک غلام خاندان غوریوں کو شکست دیتا ہے اور سلطنت دہلی کو قائم کر کے گنگا کی پوری وادی پر حکومت کرتا ہے۔ تاہم جلد ہی ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو منگول خطرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

1220-31ء: پہلا زبردست منگول حملہ، شہروں کی وسیع پیمانے پر تباہی و بربادی واقع ہوتی ہے۔

1224ء1391ء: سنہرے اردو کے منگول کیسپئین کے شمال اور بحراسود کے علاقوں پر حکومت کرتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

1225ء: الموحدین سپین کو چھوڑ دیتے ہیں جہاں مسلمانوں کا اقتدار آخرکار غرناطہ کی چھوٹی

سی سلطنت تک محدود ہو گیا ہوتا ہے۔

1227ء: منگول راہبر چنگیز خان فوت ہو جاتا ہے۔

1227ء۔1358ء: چغتائی منگول خان ماورالنہر پر حکومت کرتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

1228ء۔1551ء: تیونس میں الموحدین خاندان کی جگہ حفصی خاندان لے لیتا ہے۔

1240ء: صوفی فلسفی معید الدین ابن العربیؒ وفات پا جاتے ہیں۔

1250ء: ایک غلام فوجی دستہ یعنی مملوک ایوبیوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ وہ مصر اور شام پر حکومت قائم کرتے ہیں۔

1256ء۔1335ء: ایل خانی منگول عراق اور ایران پر حکومت کرتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

1258ء: وہ بغداد کو تباہ کر دیتے ہیں۔

1260ء: مملوک سلطان بیبرس ایل خانی منگولوں کو عین جالوت کی جنگ میں شکست دیتا ہے اور شامی ساحلوں پر بہت سے باقی ماندہ قلعوں کو برباد کر دیتا ہے۔

1273ء: رقصاں درویشوں کے بانی جلال الدین رومیؒ اناطولیہ میں وفات پا جاتے ہیں۔

1288ء: عثمان' ایک غازی' بازنطینی سرحد پر اناطولیہ میں عثمانی سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔

1326-59ء: عثمان کا بیٹا ارخان برصہ کو دارالحکومت بنا کر ایک آزاد عثمانی ریاست قائم کرتا ہے اور زوال پاتی ہوئی بازنطینی سلطنت پر غلبہ پا لیتا ہے۔

1328ء: مصلح امام احمد ابن تیمیہؒ دمشق میں وفات پا جاتے ہیں۔

1334-53ء: غرناطہ کا بادشاہ یوسف الحمرا تعمیر کرواتا ہے جسے اس کا بیٹا مکمل کرتا ہے۔

1369ء۔1405ء: تیمور لنگ ثمرقند میں چغتائی منگول اقتدار کو بحال کرتا ہے اور بیشتر مشرقِ وسطیٰ اور اناطولیہ کو فتح کر لیتا ہے نیز دہلی پر بھی قابض ہو جاتا ہے۔ تاہم اس کی وفات کے بعد سلطنت بکھر جاتی ہے۔

1389ء: عثمانی کوسوو کے میدان میں سربوں کو شکست دے کر بلقان کو زیرنگیں کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے اقتدار کو اناطولیہ تک وسعت دیتے ہیں' تاہم 1402ء میں تیمور لنگ ان کا تختہ الٹ دیتا ہے۔

1403-21ء: تیمور کی وفات کے بعد محمد اول عثمانی ریاست کو بحال کرتا ہے۔

1406ء: فیلسفوف اور تاریخ داں ابن خلدون وفات پا جاتے ہیں۔

1421-51ء: مراد اول ہنگری اور مغرب کے خلاف عثمانی اقتدار کو تسلیم کرواتا ہے۔

1453ء: محمد دوم ''الفاتح'' قسطنطنیہ کو فتح کر لیتا ہے' جو آئندہ استنبول کہلاتا ہے۔ وہ اسے عثمانی سلطنت کا دارالحکومت قرار دیتا ہے۔

1492ء: غرناطہ کی مسلمان بادشاہت پر کیتھولک بادشاہ فرڈیننڈ اور ایزابیلا فتح پا لیتے ہیں۔

1502-24ء: صفوی صوفی سلسلے کا سربراہ اسمٰعیل ایران کو فتح کر لیتا ہے جہاں وہ صفوی سلطنت قائم کرتا ہے۔ اب بارہ امامی شیعیت ایران کا سرکاری مذہب قرار پاتی ہے اور اسمٰعیل کی سنی عقاید کو دبانے کی سفاکانہ کوششوں کے نتیجے میں عثمانی سلطنت میں شیعوں پر عذاب وسزا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

1510ء: اسمٰعیل سنی ازبکوں کو خراسان سے نکال باہر کرتا ہے اور وہاں شیعہ حکمرانی قائم کر دیتا ہے۔

1513ء: پرتگیز تاجر جنوبی چین پہنچتے ہیں۔

1514ء: سلطان سلیم اول کالدیران کی جنگ میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی فوج کو شکست دیتا ہے' جس سے عثمانی علاقے میں مغرب کی جانب صفویوں کی پیش قدمی رک جاتی ہے۔

1517ء: عثمانی مملوکوں کو شکست دے کر مصر اور شام کو فتح کر لیتے ہیں۔

1520-66ء: سلیمان' جسے مغرب میں عالی شان کے نام سے جانا جاتا ہے' عثمانی سلطنت کو وسعت دیتا ہے اور اس کے منفرد اور ممتاز اداروں کو قائم کرتا ہے۔

1522ء: عثمانی رہوڈز کو فتح کر لیتے ہیں۔

1524-74ء: طہماسپ اول' ایران کا دوسرا صفوی بادشاہ وہاں شیعی غلبے کو مستحکم کرتا ہے۔ اس کا دربار فنون' خاص طور پر مصوری کا مرکز بن جاتا ہے۔

1526ء: بابر ہندوستان میں مغل سلطنت قائم کرتا ہے۔

1529ء: عثمانی ویانا کا محاصرہ کرتے ہیں۔

1542ء: پرتگیز پہلی یورپی تجارتی سلطنت (کمرشل ایمپائر) قائم کرتے ہیں۔

1543ء: عثمانی ہنگری پر تسلط جما لیتے ہیں۔

1552-6ء: روسی دریائے والگا پر واقع قازان اور استراخان کی منگول ریاستوں کو فتح کر لیتے ہیں۔

1560ء۔1605ء: اکبر مغل ہندوستان کا شہنشاہ بنتا ہے اور اپنے اقتدار کے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ اکبر ہندو مسلم تعاون کو فروغ دیتا ہے اور جنوبی ہندوستان کے علاقوں کو

فتح کر لیتا ہے۔ وہ ایک ثقافتی نشاۃ ثانیہ کی سر پرستی کرتا ہے۔
بحر ہند میں عثمانیوں اور پرتگیزوں کے مابین بحری جنگ ہوتی ہے۔

1570ء: عثمانی قبرص کو حاصل کر لیتے ہیں۔

1578ء: عثمانیوں کا درباری معمار (آرکیٹکٹ) سنان پاشا فوت ہو جاتا ہے۔

1580ء کی دہائی: پرتگیز ہندوستان میں کمزور ہو جاتے ہیں۔

1629ء۔1588ء: شاہ عباس اول اصفہان میں ایک عظیم الشان دربار تشکیل دیتے ہوئے ایران میں صفوی سلطنت پر حکومت کرتا ہے۔ وہ عثمانیوں کو آذربائیجان اور عراق سے نکال دیتا ہے۔

1590ء کی دہائی: ڈچ ہندوستان میں تجارت شروع کرتے ہیں۔

1601ء: ڈچ پرتگیزوں کے قلعوں پر قبضہ کرنے لگتے ہیں۔

1602ء: صوفی تاریخ داں ابوالفضل علامی کی وفات۔

1625ء: مصلح (ریفارمر) احمد سرہندیؒ کی وفات۔

1627-58ء: شاہجہان مغل سلطنت پر حکومت کرتا ہے جو اس کے عہد میں اپنی نفاست و لطافت کے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ وہ تاج محل تعمیر کرواتا ہے۔

1631ء: اصفہان میں شیعہ فلسفی میر دیمد کی وفات۔

1640ء: ایرانی فلسفی اور صوفی مُلّا صدرا کی وفات۔

1656ء: عثمانی وزیر عثمانی سلطنت کے زوال کو روک دیتے ہیں۔

1707ء۔1658ء: آخری بڑا مغل شہنشاہ اورنگ زیب سارے ہندوستان کو اسلامیانے کی کوشش کرتا ہے لیکن دیرپا ہندو اور سکھ معاندت کو پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

1669ء: عثمانی کریٹ کو وینس سے حاصل کر لیتے ہیں۔

1681ء: عثمانی روس کو کیف دے دیتے ہیں۔

1683ء: عثمانی ویانا کے دوسرے محاصرے میں ناکام ہو جاتے ہیں تاہم وہ عراق کو صفویوں سے دوبارہ حاصل کر لیتے ہیں۔

1699ء: کارلووچز معاہدے کے تحت عثمانی ہنگری کو آسٹریا کے حوالے کر دیتے ہیں، پہلی بڑی عثمانی پسپائی۔

1700ء: ایران کے اہم شیعہ عالم محمد باقر مجلسی کی وفات۔

1707-12ء: مغل سلطنت اپنے جنوبی اور مشرقی صوبے کھو بیٹھتی ہے۔

1715ء: آسٹریائی اور پروشیائی بادشاہتیں وجود پذیر ہوتی ہیں۔

1718-30ء: سلطان احمد سوم عثمانی سلطنت کو مغربیت سے ہم آہنگ کرنے کے لیے پہلی مرتبہ اصلاح کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر ینی چریوں کی بغاوت کی وجہ سے یہ اصلاحات ختم ہو جاتی ہیں۔

1722ء: افغان باغی اصفہان پر حملہ کرتے ہیں اور اشرافیہ کا قتل عام کرتے ہیں۔

1726ء: نادرشاہ عارضی طور پر ایرانی شیعہ سلطنت کی عسکری قوت کو بحال کرتا ہے۔

1739ء: نادرشاہ دہلی کو فتح کر لیتا ہے اور ہندوستان میں مؤثر مغل حکمرانی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

ہندو، سکھ اور افغان اقتدار کے لیے باہم نبرد آزما ہوتے ہیں۔

نادرشاہ ایران کو سنی مسلک کی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اہم ایرانی مجتہدین ایران کو چھوڑ دیتے ہیں اور عثمانی عراق میں پناہ حاصل کر لیتے ہیں جہاں وہ شاہوں سے آزاد قوت و اقتدار کا ایک مرکز قائم کر لیتے ہیں۔

1748ء: نادرشاہ کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ انتشار کا ایک دور شروع ہو جاتا ہے جس کے دوران ایرانی، جو کہ اصولی موقف پر قائم رہتے ہیں، غلبہ حاصل کر لیتے ہیں اور لوگوں کو قانون اور نظم (آرڈر) کا ایک سرچشمہ مہیا کرتے ہیں۔

1762ء: ہندوستان میں صوفی مصلح (ریفارمر) شاہ ولی اللہؒ وفات پا جاتے ہیں۔

1763ء: برطانوی منتشر ہندوستانی ریاستوں پر اپنے غلبہ کو وسعت دیتے ہیں۔

1774ء: روسی عثمانیوں کو مکمل طور پر شکست سے دوچار کر دیتے ہیں۔ وہ کریمیا گنوا بیٹھتے ہیں اور زار عثمانی سرزمین پر آرتھوڈوکس عیسائیوں کا "محافظ" بن جاتا ہے۔

1779ء: آقا محمد خان ایران میں قاچار عہد حکومت کی بنیاد رکھنا شروع کرتا ہے جو صدی کے اختتام تک مضبوط حکومت کو بحال کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔

1789ء: فرانسیسی انقلاب بپا ہوتا ہے۔

1789-1807ء: سلیم ثالث عثمانی سلطنت میں مغربیت لانے والی نئی اصلاحات کے لئے عملی اقدامات کرتا ہے اور یورپی دارالحکومتوں میں پہلے عثمانی سفارت خانے قائم کرتا ہے۔

1792ء: عسکریت پسند عرب مصلح (ریفارمر) محمد ابن عبدالوہاب کی وفات۔

1793ء: ہندوستان میں پہلے پروٹسٹنٹ مبلغین (مشنریز) کی آمد ہوتی ہے۔

1818ء-1797ء: ایران پر فتح علی شاہ حکومت کرتا ہے۔ وہاں برطانوی اور روسی اثر و رسوخ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

1801ء-1798ء: نپولین مصر پر قبضہ کر لیتا ہے۔

1803-13ء: وہابی حجاز کو عثمانی قبضے سے نکال کر اس پر غلبہ پا لیتے ہیں۔

1805-48ء: محمد علی مصر کو جدید بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

1808-39ء: سلطان محمد دوم ''تنظیمات'' کے عنوان سے عثمانی سلطنت میں جدیدیت پسندانہ اصلاحات کو متعارف کرواتا ہے۔

1814ء: معاہدہَ گلستان: کاکیشیائی علاقہ روس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

1815ء: عثمانی تسلط کے خلاف سرب بغاوت۔

1821ء: عثمانیوں کے خلاف یونانی جنگِ آزادی۔

1830ء: فرانس الجیریا پر قبضہ کر لیتا ہے۔

1831ء: محمد علی عثمانی شام پر قبضہ کر لیتا ہے اور اناطولیہ میں کافی اندر تک گھس جاتا ہے۔ وہ عثمانی سلطنت میں ایک حقیقتاً آزاد ریاست کے اندر ریاست قائم کرتا ہے۔ یورپی طاقتیں عثمانی سلطنت کے تحفظ کے لیے مداخلت کرتی ہیں اور محمد علی کو شام سے واپس ہونے پر مجبور کرتی ہیں (1841ء)۔

1836ء: نئے صوفی مصلح (ریفارمر) احمد ابن ادریسؒ کی وفات۔

1839ء: برطانوی عدن پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

1839-61ء: سلطان عبدالحمید عثمانی سلطنت کے زوال کو روکنے کے لیے زیادہ جدیدیت پسندانہ اصلاحات کا آغاز کرتا ہے۔

1843-9ء: برطانوی سندھ طاس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

1854-6ء: کریمیائی جنگ' جو عثمانی سلطنت میں عیسائی اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے پیدا ہونے والی یورپی رقابت کی وجہ سے برپا ہے۔

مصر کا گورنر سعید پاشا فرانسیسیوں کو نہر سوئز کی رعایت عطا کرتا ہے۔ مصر اپنے پہلے غیر ملکی قرض کا معاہدہ کرتا ہے۔

1857-8ء: برطانوی حکمرانی کے خلاف ہندوستانی جنگِ آزادی۔ برطانوی آخری مغل بادشاہ

کو با قاعدہ طور پر معزول کر دیتے ہیں۔ سر سید احمد خان مغربی خطوط پر اسلام میں اصلاح اور برطانوی ثقافت کو اختیار کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔

1860-61ء: لبنان میں دروز باغیوں کے ہاتھوں عیسائیوں کے قتل عام کے بعد فرانسیسی مطالبہ کرتے ہیں کہ اسے فرانسیسی گورنر کے ساتھ خود مختار صوبہ بنا دیا جائے۔

1861-76ء: سلطان عبدالعزیز عثمانی سلطنت کی اصلاح کا عمل جاری رکھتا ہے مگر بھاری غیر ملکی قرضے بھی حاصل کرتا ہے جن کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سلطنت دیوالیہ ہو جاتی ہے اور عثمانی مالیات پر یورپی حکومتوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

1863-79ء: مصر کا گورنر اسمٰعیل پاشا وسیع پیمانے پر جدیدیت کو اپناتا ہے مگر غیر ملکی قرضے بھی حاصل کرتا ہے جس کا نتیجہ دیوالیے اور نہر سوئز کی برطانویوں کے ہاتھ فروخت (1875ء) اور مصری مالیات پر یورپی تسلط کی صورت میں نکلتا ہے۔

1871-9ء: ایرانی مصلح (ریفارمر) الافغانی مصر میں رہتے ہیں اور محمد عبدہٗ سمیت مصری مصلحین (ریفارمر) کا ایک حلقہ تشکیل دیتے ہیں۔ ان کا مقصد اسلام کے احیاء اور جدیدیت پذیری (ماڈرنائزیشن) کے ذریعے یورپ کے ثقافتی غلبہ و تسلط کو روکنا تھا۔

1872ء: ایران میں برطانوی روسی رقابت شدت پکڑ لیتی ہے۔

1876ء: عثمانی سلطان عبدالعزیز کو محلاتی انقلاب کے ذریعے معزول کر دیا جاتا ہے۔ عبدالحمید ثانی پہلے عثمانی دستور کو نافذ کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ تاہم وہ اسے بعد میں معطل کر دیتا ہے۔ تعلیم، ذرائع آمدورفت اور ذرائع مواصلات میں بڑی عثمانی اصلاحات۔

1879ء: اسمٰعیل پاشا کو معزول کر دیا جاتا ہے۔

1881ء: فرانس تیونس پر قبضہ کر لیتا ہے۔

1881-2ء: آئین پسندوں اور اصلاح پسندوں کے ساتھ مل کر مقامی مصری افسر بغاوت کر دیتے ہیں، جو خدیو توفیق پر اپنی حکومت نافذ کرتے ہیں۔ تاہم ایک عوامی ابھار مصر پر برطانوی قبضے کی راہیں کشادہ کرتا ہے جس میں لارڈ کرومر گورنر بنتا ہے۔(1882ء-1907ء)۔

شام کی آزادی کے لئے خفیہ انجمنوں کی مہم۔

1889ء: برطانوی سوڈان پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

1892ء: ایران میں تمباکو کا بحران۔ شاہ کو ایک ممتاز مجتہد کا فتویٰ برطانویوں کو تمباکو کے سلسلے میں دی گئی رعایت منسوخ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

1894ء: عثمانی حکومت کے مخالف دس سے بیس ہزار کے درمیان آرمینیائیوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا جاتا ہے۔

1896ء: ایران کے ناصرالدین شاہ کو الافغانی کا ایک شاگرد قتل کر دیتا ہے۔

1897ء: باسل میں پہلی صیہونی کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ اس کا حتمی مقصد عثمانی صوبے فلسطین میں ایک یہودی ریاست تخلیق کرنا ہوتا ہے۔

الافغانی کی وفات۔

1901ء: ایران میں تیل دریافت ہوتا ہے اور برطانویوں کو رعایت دے دی جاتی ہے۔

1903-14ء: برطانویوں کے بنگال کو تقسیم کرنے سے خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں' اسی خوف سے فرقہ وارانہ بے چینی پیدا ہوتی ہے اور مسلم لیگ کا قیام عمل میں آتا ہے (1906ء)۔

1905ء: مصری مصلح (ریفارمر) محمد عبدہ' وفات پا جاتے ہیں۔

1906ء: ایران میں ایک دستوری انقلاب شاہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دستور کا اعلان کرے اور ایک مجلس قائم کرے تاہم ایک انگریز روسی (اینگلو رشیئن) معاہدہ (1907ء) اور شاہ کی طرف سے روسی حمایت کے ساتھ ہونے والا ردِ انقلاب دستور کو منسوخ کر دیتا ہے۔

1908ء: ''نوجوان ترکوں'' (The Young Turks) کا انقلاب سلطان کو دستور کی بحالی پر مجبور کر دیتا ہے۔

1914-18ء: پہلی عالمی جنگ۔

برطانیہ مصر کو اپنا محروسہ ملک قرار دے دیتا ہے' ایران پر برطانوی اور روسی فوجیں قبضہ کر لیتی ہیں۔

1916-21ء: عرب برطانویوں کے اشتراک سے عثمانیوں کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔

1917ء: بالفور اعلان (The Balfour Declaration) برطانیہ کو فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کے لیے باقاعدہ تائید و حمایت مہیا کرتا ہے۔

1919-21ء: ترک جنگِ آزادی۔ اتاترک یورپی طاقتوں کو خلیج میں روکے رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک آزاد ترک ریاست قائم کرتا ہے۔ وہ سیکولر اور جدیدیت پسندانہ انقلابی پالیسیاں اختیار کرتا ہے (1924-8ء)۔

1920ء: سائیکس پائیکاٹ معاہدے کی اشاعت: پہلی عالمی جنگ میں عثمانی سلطنت کی شکست کے بعد اس کے صوبہ جات برطانیہ اور فرانس میں تقسیم ہو جاتے ہیں جو انتداب اور حفاظتی علاقے قائم کرتے ہیں حالانکہ عربوں سے جنگ کے بعد آزادی کا وعدہ کیا گیا ہوتا ہے۔

1920-22ء: گاندھی برطانوی حکمرانی کے خلاف عوامی نافرمانی کی دو مہمات کے ذریعے ہندوستان کے عام لوگوں کو متحرک و بیدار کرتا ہے۔

1921ء: رضا خان ایران میں ایک کامیاب انقلاب کی قیادت کرتا ہے اور پہلوی عہد حکومت کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ ایران میں ایک بے رحمانہ سیکولر اور جدت پسندانہ پالیسی کو متعارف کرواتا ہے۔

1922ء: مصر کو رسماً آزادی مل جاتی ہے تاہم برطانیہ دفاع، خارجہ پالیسی اور سوڈان پر کنٹرول برقرار رکھتا ہے۔ 1923ء سے 1930ء کے دوران مقبولِ عام وفد پارٹی تین قانونی انتخابی فتوحات حاصل کرتی ہے لیکن ہر مرتبہ اسے یا تو برطانیہ یا بادشاہ مستعفی ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

1932ء: مملکتِ سعودی عرب قائم کی جاتی ہے۔

1935ء: مصر میں سلفیہ تحریک کے بانی، مصلح (ریفارمر) اور صحافی راشد رضا کی وفات۔

1938ء: ہندوستانی شاعر اور فلسفی محمد اقبالؒ وفات پا جاتے ہیں۔

1939-45ء: دوسری عالمی جنگ۔ برطانوی رضا شاہ کو معزول کر دیتے ہیں، جس کا جانشین اس کے بیٹے محمد رضا کو بنایا جاتا ہے (1944ء)۔

1940ء کی دہائی: اخوان المسلمون مصر میں سب سے زیادہ مضبوط سیاسی قوت بن جاتی ہے۔

1945ء: ترکی اقوام متحدہ میں شامل ہو جاتا ہے اور ایک کثیر جماعتی ریاست بن جاتا ہے (1947ء)۔ عرب لیگ کی تشکیل۔

1946ء: ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے بعد مسلم لیگ ایک الگ ریاست کے لئے تحریک شروع کرتی ہے۔

1947ء: مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل پاکستان وجود میں آتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں اور ہندوؤں ہر دو کا قتل عام وقوع پذیر ہوتا ہے۔

1948ء: اقوام متحدہ کے ایک اعلامئے (ڈیکلریشن) کے نتیجے میں فلسطین میں برطانوی انتداب ختم ہو جاتا ہے اور یہودی ریاست اسرائیل وجود میں آتی ہے۔ اسرائیلی فوجیں پانچ عرب ملکوں کی افواج کو شکست دیتی ہیں جنہوں نے نوزائیدہ یہودی ریاست پر چڑھائی کی ہوتی ہے۔ یہودیوں کے ظلم وستم کی وجہ سے ساڑھے سات لاکھ (750,000) فلسطینی ملک چھوڑ دیتے ہیں اور بعد میں انہیں اپنے گھروں کو واپس آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

1951-3ء: محمد مصدق اور قومی محاذ جماعت (National Front Party) ایرانی تیل کو قومیا لیتے ہیں۔ شاہ مخالف مظاہروں کے بعد شاہ ایران سے فرار ہو جاتا ہے مگر سی آئی اے اور برطانوی انٹیلی جنس کے منظم کردہ انقلاب کے بعد واپس آ جاتا ہے اور تیل کی یورپی کمپنیوں کے ساتھ نئے معاہدے عمل میں آتے ہیں۔

1952ء: مصر میں جمال عبدالناصر کی قیادت میں ''آزاد افسران'' کے انقلاب میں شاہ فاروق کو معزول کر دیا جاتا ہے۔ ناصر اخوان المسلمون پر جبر واستبداد روا رکھتا ہے اور ہزاروں اخوانوں کو عقوبت خانوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔

1954ء: الجیریا میں سیکولر نیشنل لبریشن فرنٹ (NLF قومی محاذِ آزادی) فرانسیسی نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف انقلاب کی قیادت کرتا ہے۔

1956ء: پاکستان کا پہلا آئین منظور کیا جاتا ہے۔ جمال عبدالناصر نہر سوئیز کو قومیا لیتے ہیں۔

1957ء: ایران میں شاہ محمد رضا پہلوی امریکی سی آئی اے اور اسرائیلی موساد (MOSSAD) کی معاونت سے خفیہ پولیس ساواک (SAVAK) کی بنیاد رکھتا ہے۔

1958-69ء: پاکستان میں جنرل محمد ایوب خان کی سیکولر حکومت۔

1961ء: شاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی جدیدیت پذیری (ماڈرنائزیشن) کے سفید انقلاب کا اعلان کرتا ہے' جس میں مذہب کو محدود کر دیا جاتا ہے اور ایرانی معاشرے کے اندر تقسیم واقع ہوتی ہے۔

1963ء: این ایل ایف الجیریا میں سوشلسٹ حکومت قائم کر دیتا ہے۔

آیت اللہ خمینی پہلوی شہنشاہی پر تنقید کرتے ہیں' پورے ایران میں عوامی مظاہرے کرواتے ہیں۔ انہیں پہلے حوالہ زنداں کر دیا جاتا ہے اور بالآخر جلاوطن کر کے عراق بھیج دیا جاتا ہے۔

1966ء: ناصر ممتاز مصری بنیاد پرست نظریہ ساز سید قطب کو سزا کا حکم دیتا ہے۔

1967ء: اسرائیل اور اس کے عرب پڑوسیوں کے درمیان چھ روزہ جنگ ہوتی ہے۔ اسرائیل کی فتح اور عربوں کی شکست کی وجہ سے پورے مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی احیا رونما ہوتا ہے چونکہ سیکولر پالیسیاں ناقابلِ اعتبار دکھائی دیتی ہیں۔

1970ء: ناصر فوت ہو جاتا ہے' انورالسادات اس کا جانشین بنتا ہے۔ وہ مصری اسلام پسندوں کی حمایت اور تائید حاصل کرنے کے لیے انہیں حکومت میں شامل کرتا ہے۔

1971ء: شیخ احمد یاسین مجامعہ (کانگرس) کے نام سے ایک فلاحی تنظیم (ویلفیئر آرگنائزیشن) قائم کرتے ہیں اور فلسطین کا ایک اسلامی تشخص حاصل کرنے کے لیے پی ایل او کی سیکولر قوم پرستی کے خلاف مہم چلاتے ہیں۔ مجامعہ کو اسرائیل کی مدد حاصل ہوتی ہے۔

1971-7ء: پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو ایک بائیں بازو کی (لیفٹسٹ) سیکولر حکومت قائم کرتے ہیں جو اسلام پسندوں کو رعایتیں تو دیتی ہے مگر یہ اقدامات اطمینان بخش نہیں ہوتے۔

1973ء: یوم کپور پر مصر اور شام اسرائیل پر حملہ کر دیتے ہیں اور جنگ کے میدان میں ایسی پراثر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو سادات کو 1978ء میں کیمپ ڈیوڈ میں جرأت مندانہ امن معاہدہ کرنے کی حیثیت دلا دیتی ہے۔

1977-88ء: پاکستان میں راسخ العقیدہ مسلمان ضیاء الحق ایک کامیاب انقلاب کی قیادت کرتے ہیں اور ایک زیادہ اسلامی حکومت قائم کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ حقیقی سیاست سے مذہب کو الگ رکھتے ہیں۔

1978-9ء: انقلابِ ایران۔ آیت اللہ خمینی اسلامی جمہوریہ کے اعلیٰ ترین فقیہہ بن جاتے ہیں (1979-89ء)۔

1979ء: پاکستان کے بنیاد پرست نظریہ ساز ابوالاعلیٰ مودودی وفات پا جاتے ہیں۔

بہت سے سنی بنیاد پرست مکہ میں کعبہ پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اپنے لیڈر کے مہدی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ریاست ان کا قبضہ ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

1979-81ء: تہران میں امریکی سفارت خانے میں امریکی یرغمالیوں کو قیدی بنالیا جاتا ہے۔

1981ء: صدر انورالسادات کو مسلمان انتہا پسند قتل کر دیتے ہیں جو مصری لوگوں کے ساتھ ان کے غیر منصفانہ اور جابرانہ برتاؤ نیز اسرائیل کے ساتھ ان کے معاہدۂ امن کی مذمت کرتے ہیں۔

1987ء: مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر اسرائیلی قبضے کے خلاف انتفاضہ کے نام سے فلسطینیوں کے عوامی احتجاجی مظاہرے شروع ہوتے ہیں۔ مجامعہ کی ایک ذیلی تنظیم حماس اب پی ایل او کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی مخالفت بھی شروع کر دیتی ہے۔

1989ء: آیت اللہ خمینی برطانوی مصنف سلمان رشدی کے ناول ''شیطانی آیات'' (The Satanic Verses) میں حضرت محمد ﷺ کی توہین آمیز تصویر کشی کے خلاف فتویٰ جاری کرتے ہیں۔ ایک ماہ بعد اسلامی کانفرنس کے انچاس ارکان میں سے اڑتالیس ارکان اس فتوے کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔

آیت اللہ خمینی کی وفات کے بعد آیت اللہ خامنہ ای ایران کے اعلیٰ ترین فقیہہ بن جاتے ہیں اور عملیت پسند حجتہ الاسلام رفسنجانی صدر بن جاتے ہیں۔

1990ء: الجیریا کے مقامی انتخابات میں اسلامی محاذ آزادی (ایف آئی ایس) سیکولر ایف ایل این کے خلاف زبردست کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ 1992ء کے قومی انتخابات میں ان کی فتح یقینی دکھائی دینے لگتی ہے۔

صدر صدام حسین، ایک سیکولر حکمران، کویت پر حملہ کر دیتے ہیں، اس کے جواب میں امریکہ اور اس کے مغربی اور مشرقِ وسطیٰ کے اتحادی عراق کے خلاف آپریشن ڈیزرٹ سٹارم (Operation Desert Storm) شروع کرتے ہیں (1991ء)۔

1992ء: الجیریا میں فوج ایف آئی ایس کو اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے انقلاب بپا کرتی ہے اور تحریک کو دبا دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں زیادہ انقلابی ارکان ایک

ہولناک دہشت گردانہ مہم کا آغاز کرتے ہیں۔

ایودھیا میں ہندو جماعت بی جے پی کے ارکان بابری مسجد کو شہید کر دیتے ہیں۔

1992-9ء: سرب اور کروٹ قوم پرست منصوبہ بندی کے ساتھ بوسنیا اور کوسوو کے مسلمان باسیوں کو قتل اور گھروں کو چھوڑ دینے پر مجبور کرتے ہیں۔

1993ء: اسرائیل اور فلسطین معاہدۂ اوسلو پر دستخط کرتے ہیں۔

1994ء: حیبرون کی ایک مسجد میں ایک یہودی انتہا پسند کے ہاتھوں انتیس (29) مسلمانوں کے قتل کے بعد حماس کے خودکش بمباز اسرائیل میں یہودیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔

اوسلو معاہدے پر دستخط کرنے کی وجہ سے ایک یہودی انتہا پسند صدر اسحاق رابن کو قتل کر دیتا ہے۔

افغانستان میں طالبان بنیاد پرست اقتدار میں آجاتے ہیں۔

1997ء: لبرل مُلّا حجتہ الاسلام سید خاتمی انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کرتے ہوئے ایران کے صدر منتخب ہو جاتے ہیں۔

1998ء: صدر خاتمی سلمان رشدی کے خلاف خمینی کے فتوے سے اپنی حکومت کی لاتعلقی کا اعلان کرتے ہیں۔

✿ ✿ ✿ ✿

حصہ اوّل

شروعات

رسول اللہ ﷺ (570ء-632ء)

610ء میں رمضان کے مقدس مہینے کے دوران ایک عظیم عرب شخصیت کو ایک ایسا تجربہ ہوا جس نے دنیا کی تاریخ کو تبدیل کر دیا۔ ہر سال اسی مہینے میں حضرت محمدؐ ابن عبداللہ مکہ سے تھوڑا ہی باہر واقع کوہِ حرا کی چوٹی پر بنے غار میں جایا کرتے تھے جہاں وہ عبادت کرتے، روزے رکھتے اور غریبوں کو خیرات دیا کرتے تھے۔ وہ عرب معاشرے کے بحران پر کافی لمبی مدت سے پریشان ومتفکر تھے۔ حالیہ عشروں میں ان کا قبیلہ قریش اردگرد واقع ملکوں میں تجارت کے ذریعے امیر ہو چکا تھا۔ مکہ ایک کامیاب ہوتا اور پنپتا ہوا تجارتی شہر بن چکا تھا تاہم دولت کے لیے جاری جارحانہ افراتفری میں کچھ پرانی قبائلی اقدار کھو چکی تھیں۔ اب قریش بدوی ضابطے کے تحت قبیلے کے کمزور ارکان کی دیکھ بھال کرنے کی بجائے قبیلے کے غریب خاندانوں کی قیمت پر دولت بنانے کی طرف مائل تھے۔ مکہ اور پورے جزیرہ نما میں روحانی اضطراب بھی موجود تھا۔ پورے عرب میں قتل اور جوابی قتل کے ہلاکت انگیز چکر میں ایک قبیلہ دوسرے کے ساتھ لڑائی میں مصروف تھا۔ اس صورتحال سے عرب کے بہت سے اہل فکر لوگوں کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے عرب کوئی کھوئی ہوئی نسل ہوں، مہذب دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکالے ہوئے ہوں اور جنہیں خود خدا نے ہی دھتکار دیا ہوا ہو۔ تاہم یہ احساس 17 رمضان کی شب اس وقت تبدیل ہو گیا جب حضرت محمد ﷺ نے اپنے آپ کو ایک محیرالعقول حضوری کی وجہ سے بہت زیادہ قوت سے معمور پایا جو اس وقت تک ان پر حاوی رہی جب تک انہوں نے ایک نئے عربی صحیفے کا پہلا لفظ اپنے مبارک ہونٹوں پر رواں نہیں پایا۔

شروع کے دو برس تک تو حضرت محمد ﷺ اپنے تجربے کے حوالے سے خاموش ہی رہے۔ آپؐ پر تازہ وحیاں نازل تو ہوئیں مگر آپ ﷺ نے انہیں اپنی زوجۂ محترمہ اُم المومنین

حضرت خدیجہؓ اور ان کے عیسائی کزن ورقہ بن نوفل تک ہی محدود رکھا۔ ان دونوں کو یقین تھا کہ یہ وحیاں خدا کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں تاہم ایسا صرف 612ء ہی میں ہوا کہ حضرت محمد ﷺ نے تبلیغ کا آغاز کیا اور بتدریج لوگ ایمان لانے لگے' جن میں شامل تھے آپ ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ ابن ابی طالب' آپ ﷺ کے دوست حضرت ابوبکرؓ اور طاقتور اُمیہ خاندان کے نوجوان تاجر حضرت عثمانؓ ابن عفان۔ آپؐ پر ایمان لانے والوں میں سے بہت سے لوگ' جن میں عورتوں کی ایک خاص تعداد بھی شامل تھی' بہت غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ دوسرے لوگ مکہ میں رونما ہونے والی اس نابرابری پر ناخوش تھے' جسے وہ عرب روح کے لیے اجنبی تصور کرتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کا پیغام تو سادہ سا تھا:

آپ ﷺ نے اس بات پر زور دیا کہ فقط اپنی قسمت سنوارنا غلط ہے بلکہ دولت کو بانٹنا اور ایک ایسے معاشرے کو تخلیق کرنا درست ہے جہاں کمزوروں اور بے بس ولاچار لوگوں کے ساتھ احترام والا برتاؤ کیا جائے۔ اگر قریش نے اپنے اطوار کو درست نہیں کیا تو ان کا معاشرہ تباہ ہو جائے گا (جیسا کہ ماضی میں دوسرے غیر منصفانہ معاشروں کے ساتھ ہوا تھا) کیونکہ وہ ہستی کے بنیادی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

یہ تھیں اس نئے صحیفے کی تعلیمات' جس کو قرآن کہا گیا۔ اگلے اکیس برسوں میں قرآن حضرت محمد ﷺ پر آیت بہ آیت' سورت بہ سورت نازل ہوتا رہا' اکثر کسی بحران کے حل کی صورت میں یا ایمان والوں کی مختصر برادری میں ابھرنے والے سوالوں کے جواب میں۔ وحی حضرت محمد ﷺ کے لیے ایک عجیب کیفیت ہوا کرتی تھیں' جو فرمایا کرتے تھے: ''مجھے کبھی ایک وحی بھی ایسی موصول نہیں ہوئی جب میں نے اپنی روح کو خود سے جدا ہوتے ہوئے نہیں محسوس کیا ہو[1]'' شروع کے دنوں میں تو یہ تاثر ایسا ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کے بدن پر جھرجھری طاری ہو جاتی' آپ ﷺ کو ٹھنڈے دن میں بھی بہت زیادہ پسینہ آجاتا تھا نیز بہت زیادہ بوجھ کا احساس ہوتا یا آپ ﷺ اجنبی آوازیں اور صدائیں سنا کرتے۔

بیشتر ابتدائی ایمان لانے والوں نے قرآن کی بے انتہا تاثیر کی وجہ سے مذہب تبدیل کیا تھا' جو کہ ان کی عمیق ترین آرزوؤں سے ہم آہنگ تھا۔ اس نے عظیم فن کے سے انداز میں ان کی پہلے ہی سے قائم کی ہوئی دانش ورانہ آراء و تصورات کو رد کر کے دماغ سے کہیں زیادہ گہری سطح پر متاثر کرتے ہوئے ان کی زندگی کا اسلوب ہی سراسر تبدیل کر دیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز حضرت عمرؓ بن خطاب کی تبدیلیٔ مذہب تھی' جو کہ پرانی بت

پرستی سے وابستہ' حضرت محمد ﷺ کے پیغام کے جذباتی مخالف اور نئے مذہب کو مٹا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ تاہم حضرت عمرؓ پہلی مرتبہ ہی قرآن کے الفاظ سن کر اس کی غیر معمولی بلاغت سے مسحور ہو گئے۔ جیسا کہ انہوں نے کہا تھا کہ قرآن کی زبان نے اس پیغام کے بارے میں ان کے تمام تحفظات کو ختم کر دیا: ''جب میں نے قرآن سنا تو میرا دل نرم ہو گیا اور میں رو دیا اور اسلام میرے اندر (قلب میں) داخل ہو گیا۔''[12]

نیا مذہب اسلام (اطاعت' تسلیم و رضا) کہلایا اور ایک مسلمان ایسا مرد یا عورت ہوتی تھی جس نے اللہ کے روبرو کامل اطاعت و فرماں برداری اختیار کر لی ہو اور اللہ کے اس مطالبے کو مکمل طور پر تسلیم کر لیا ہو کہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ عدل و انصاف' برابری اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ اس رویے کا اظہار عبادت (صلوٰۃ) کے رکوع و سجود میں ہوتا تھا' جو مسلمانوں پر دن میں پانچ مرتبہ ادا کرنا فرض تھی۔ پرانی قبائلی اخلاقیات اجتماعی نوعیت کی تھی' عربوں نے بادشاہت کو تسلیم نہیں کیا تھا اور کسی غلام کی طرح زمین پر جھکنا ان کے لیے نفرت کے قابل اور ناپسندیدہ تھا۔ تاہم رکوع و سجود کو اس تکبر اور خود پرستی کا قلع قمع کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا جو مکہ میں تیزی سے فروغ پا رہی تھی۔ نماز نے مسلمانوں کو از سرِ نو تعلیم دی اور انہیں درس دیا کہ وہ اپنے غرور و تکبر اور خود غرضی کو ترک کر دیں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ خدا کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ قرآن کی محکم تعلیمات پر پورا اترنے کی غرض سے مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ اپنی آمدنی کو ایک باقاعدہ تناسب سے غریبوں کو زکوٰۃ کی صورت میں دیں۔ وہ خود کو ان غریبوں کی مفلسی و محرومی یاد دلانے کے لیے رمضان کے مہینے میں روزے رکھا کرتے تھے' جو اپنی مرضی سے جب چاہیں کھا پی نہیں سکتے تھے۔

چنانچہ معاشرتی انصاف (سوشل جسٹس) اسلام میں سب سے اہم نیکی تھی۔ مسلمانوں کو اولین فریضے اور ذمہ داری کے طور پر حکم دیا گیا تھا کہ وہ عملی ہمدردی کے وصف سے مملو ایک امت کو تشکیل دیں جس میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو۔ یہ خدا کے بارے میں کسی بھی فلسفیانہ تعلیمات سے زیادہ اہمیت کی حامل خصوصیت تھی۔ درحقیقت قرآن الٰہیاتی قیاسات کی نفی کرتا ہے جسے وہ ''ظن'' کہتا ہے یعنی ایسے ماورائے بیان معاملات کے بارے میں خود ساختہ باتیں جن کی کوئی شخص کسی بھی طریقے سے تحقیق و توثیق نہیں کر سکتا۔ ایسے ناقابل فہم عقائد کے بارے میں بحث کرنا فضول لگتا تھا جبکہ ''جہاد'' کی اہمیت بہت زیادہ تھی یعنی اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرنا۔ مسلمانوں کے لئے اُمت

کی سیاسی اور سماجی فلاح و بہبود مذہبی قدر و قیمت کی حامل ہوتی تھی۔ اگر اُمت خوشحال ہوتی تو یہ اس امر کی علامت سمجھی جاتی کہ مسلمان اللہ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایک حقیقی اسلامی امت میں زندگی بسر کرنے کا تجربہ، جس میں الوہی ہستی کے حضور یہ وجودی اطاعت ظہور میں آتی ہے، مسلمانوں کو مقدس ماورائیت عطا کرتا تھا۔ نتیجتاً وہ اُمت کو درپیش کسی بھی بدقسمتی یا ذلت سے اسی طرح متاثر ہوتے جس طرح عیسائی کسی شخص کو بائبل کا توہین آمیز استرداد کرتے دیکھ کر متاثر ہوتے یا مقدس عناصر کی توہین کرتے دیکھ کر۔

یہ معاشرتی فکرمندی عظیم عالمی مذاہب کی بصیرت کا ایک جوہری حصہ رہی ہے جو کہ اس عرصے کے دوران میں وجود پذیر ہوئے تھے جسے تاریخ داں ایگزیئل عہد کہتے ہیں (700 ق۔م سے 200 ق۔م تک) جب، جیسا کہ ہم اسے جانتے ہیں، تہذیب (سویلائزیشن) اعترافی عقائد کے ہمراہ پروان چڑھی، جنھوں نے انسانیت کو ترقی دینا جاری رکھا یعنی چین میں تاؤمت اور کنفیوشس مت، ہندوستان میں ہندومت اور بدھ مت، مشرقِ وسطیٰ میں وحدانیت اور یورپ میں عقل پرستی۔ یہ عقائد پرانی بت پرستی کی اصلاح کے نتیجے میں رونما ہوئے تھے جو کہ ان زیادہ بڑے اور پیچیدہ معاشروں کے لئے ناکافی ہو گئی تھی جو اس وقت تشکیل پائے تھے جب لوگوں نے اس ثقافتی کاوش کی اعانت کرنے والی تاجرانہ معیشت وضع کر لی تھی۔ زیادہ بڑی ریاستوں میں لوگوں کے آفاق بھی وسیع ہو گئے اور پرانے مسلک غیر موزوں ہو کر رہ گئے، یوں رفتہ رفتہ ایگزیئل عہد کے عقیدے ایک دیوتا یا ماورائیت کی اعلیٰ ترین علامت میں مجتمع ہو گئے۔ کچھ عقیدے اپنے معاشرے کی بنیادی ناانصافی کی اصلاح کے لیے سامنے آئے تھے۔ تمام قبل از جدیدیت تہذیبیں اضافی زرعی پیداوار پر استوار تھیں، جس کا انحصار کاشت کاروں کی محنت پر تھا، جو اس اعلیٰ ثقافت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے تھے جو کہ صرف اشرافیہ کے لیے مخصوص تھی۔ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے نئے عقائد نے ہمدردی، شفقت، ترس اور رحمدلی پر زور دیا۔ عرب مہذب دنیا سے باہر تھا۔ اس کی بے لگام آب و ہوا کی وجہ سے عربوں کو تقریباً قحط کی حالت میں جینا پڑتا تھا، ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ وہ اضافی زرعی پیداوار حاصل کر سکیں جو انہیں ساسانی فارس یا بازنطین کے برابر لا کھڑا کرے۔ تاہم جب قریش نے منڈی کی معیشت کو فروغ دینا شروع کیا تو ان کا تناظر تبدیل ہونے لگا۔ بہت سے قریش پرانی بت پرستی ہی سے خوش تھے تاہم خدائے واحد کی پرستش کا رجحان غالب آ رہا تھا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مکہ میں ابھرتی ہوئی نئی تہذیب کی نابرابری کے بارے میں بے

چینی پھیل رہی تھی۔ اب عرب اپنے ایگزیئل عہد کے عقیدے کو ماننے کے لیے تیار تھے۔

تاہم اس سے مراد روایت سے مکمل انکار نہیں تھا۔ ایگزیئل عہد کے تمام پیغمبروں اور مصلحین نے اپنے اپنے مذاہب کی بنیاد پرانی رسومات پر ہی رکھی تھی اور حضرت محمدؐ نے بھی ایسا ہی کیا۔ انہوں نے یہ ضرور تقاضا کیا کہ وہ منات، لات اور عزیٰ جیسے مقبولِ عام دیوتاؤں کا مسلک ترک کر دیں اور صرف اللہ کی عبادت کریں۔ قرآن مشرکوں کے دیوتاؤں کو ان قبائلی سرداروں سے، تشبیہہ دیتا ہے جن پر اپنے عوام کی ذمہ داری تھی، کیونکہ وہ انہیں تشفی بخش تحفظ مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن وحدانیت کے لیے کوئی فلسفیانہ دلائل پیش نہیں کرتا بلکہ اس کا اسلوب تو عملی تھا اور اسی طرح اس نے عملیت پسند عربوں کو متاثر کیا۔ قرآن کا دعویٰ تھا کہ پرانا مذہب بیکار ہو کر رہ گیا ہے[31] روحانی بے چینی، پرانی اور تباہ کن جنگوں اور ناانصافی نے بہترین روایات اور قبائلی ضابطوں کو برباد کر ڈالا تھا۔ مستقبل خدائے واحد اور ایک متحدہ اُمت کا تھا جس میں انصاف اور برابری کی حکمرانی ہونی تھی۔

انقلابی انداز میں قرآن نے اس امر پر زور دیا کہ اس کا پیغام تو بس ان سچائیوں کو ''یاد دلانے والا'' ہے جنہیں ہر شخص جانتا ہے[4]۔ یہ وہی اولین عقیدہ ہے جس کی تبلیغ ماضی کے پیغمبر ساری انسانیت کو کر چکے تھے۔ خدا نے انسانوں کو اس طریقے سے ناواقف نہیں رہنے دیا تھا جس کے مطابق انہیں جینا چاہیے یعنی اس نے زمین پر موجود ہر قوم کے لیے پیغمبر بھیجے تھے۔ اسلامی روایت نے بعد میں تسلیم کرنا تھا کہ ایسے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے گئے تھے، وہ سب اپنے اپنے لوگوں کے لئے الوہی صحیفہ لائے تھے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے خدا کے مذہب کی سچائیاں مختلف انداز سے بیان کی ہوں تاہم پیغام جوہری طور پر ایک ہی رہا تھا۔ اب آخر کار خدا نے قریش پر بھی ایک پیغمبر اور ایک صحیفہ نازل فرما دیا تھا۔ قرآن مستقل طور پر واضح کرتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ پرانے مذہبوں کو منسوخ کرنے، ان کے پیغمبروں سے اختلاف کرنے یا کوئی نیا عقیدہ شروع کرنے نہیں آئے تھے۔ آپ ﷺ کا پیغام حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ یا حضرت عیسیٰؑ کے پیغام جیسا ہی تھا[5]۔

قرآن صرف انہیں پیغمبروں کا ذکر کرتا ہے جن کو عرب جانتے تھے۔ قرآن اس امر پر بھرپور زور دیتا ہے کہ ''عقیدے کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہوگا''[6] اور مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے عقائد کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے، جنہیں قرآن ''اہل الکتاب'' کہتا ہے، یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا ترجمہ عمومی طور پر ''کتاب والے لوگ'' کیا جاتا ہے تاہم اس کا

درست ترجمہ ہے: ''سابقہ وحی کے حامل لوگ'':

سابقہ وحی کے ماننے والوں سے بحث وتکرار مت کرو بلکہ ان کے
ساتھ نرمی سے بات کرو ـــــ تاوقتیکہ وہ برائی کی طرف مائل نہ ہوں ـــــ
اور کہو: ''ہم بھی اسی پر ایمان رکھتے ہیں جو کہ اوپر سے نازل کیا گیا ہے
اسی طرح جس طرح کہ تمہیں اس سے سرفراز کیا گیا ہے' کیونکہ ہمارا
اور تمہارا خدا ایک ہے اور ہم سب اسی کی اطاعت کرتے ہیں'' ؎

جدیدیت سے پہلے کے معاشرے میں تسلسل بہت اہم ہوتا تھا۔ حضرت محمدؐ نے ماضی سے یا دوسری مذہبی برادریوں سے متشددانہ انقطاع نہیں کیا تھا۔ آپ ﷺ تو خواہش مند تھے کہ نئے صحیفے کی جڑیں عرب کی روحانی سرزمین میں ہوں۔

لہٰذا حضرت محمد ﷺ نے کعبہ میں روایتی عبادت کو ادا کرنا جاری رکھا۔ کعبہ مکہ کے وسط میں ایک مکعبی شکل کی عمارت ہے' جو عرب میں سب سے زیادہ اہمیت والا عبادت کا مرکز تھا۔ حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں بھی وہ بہت قدیم تھا اور گو کہ اس سے وابستہ مسلک کا اصل مفہوم فراموش کیا جا چکا تھا تاہم عرب اب بھی اس سے بہت محبت کرتے تھے اور سارے جزیرہ نما سے ہر سال وہاں حج ادا کرنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ جیسے زمین سورج کے گرد گھومتی ہے' ویسے ہی وہ سات مرتبہ اس کے گرد گھومتے تھے' وہ کعبہ کی دیوار میں نصب' اس مقام کو جنت سے ملانے والے حجر اسود کو چومتے تھے۔ یہ عبادت (عمرہ) کسی بھی وقت ادا کی جا سکتی تھی تاہم حج کے دوران میں وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے۔ پھر وہ مکہ کے مضافات میں عرفات کے میدان میں جاتے' وہاں وہ شب بیداری کرتے تھے' پھر وہ مزدلفہ میں جاتے' منیٰ میں ایک چٹان پر کنکر مارتے' اپنے سر منڈواتے اور اس عبادت کے آخری دن عیدالاضحیٰ کو وہ کسی جانور کی قربانی دیتے۔

کعبہ کے مسلک میں برادری کا آدرش مرکزیت رکھتا تھا۔ مکہ اور اس کے قرب و جوار کے علاقے میں تشدد منع تھا۔ یہ قریش کی تجارتی کامیابی کا ایک کلیدی عامل تھا کیونکہ اسی نے عربوں کو وہاں بدلے کی جنگوں کے خوف کے بغیر تجارت کرنے کا اہل بنا دیا تھا۔ حج کے دوران میں زائرین کے لیے اسلحہ رکھنے بحث وتکرار کرنے' شکار کرنے' حتیٰ کہ کسی کیڑے کو مارنے اور جرح کرنے پر بھی پابندی ہوتی تھی۔ یہ سب چیزیں حضرت محمد ﷺ کے امت کے مثالیئے (آئیڈیل) سے موافقت رکھتی تھیں اور وہ خود بھی اس زیارت گاہ سے عقیدت رکھتے

تھے۔ آپ ﷺ اکثر عمرہ ادا کرتے اور کعبہ میں قرآن کی تلاوت کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ باضابطہ طور پر یہ زیارت گاہ دیوتا حبل سے منسوب تھی اور وہاں کعبہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت رکھے گئے تھے' شاید سال کے دنوں کی ترجمانی کرتے ہوئے۔ تاہم حضرت محمد ﷺ کے زمانے تک ایسا لگتا ہے کہ کعبہ خدائے بزرگ و برتر ''اللہ'' کی عبادت گاہ کے طور پر قابل احترام ہو گیا تھا اور وہ اس فروغ پاتے ہوئے ادراک کی علامت تھی کہ اللہ اس خدا جیسا ہے جس کی پرستش وہ وحدانیت پرست عرب کرتے تھے جو بازنطینی سلطنت کی سرحدوں کے قریب رہنے والے شمالی قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے اور عیسائی ہو چکے تھے لیکن مشرکین کے ہمراہ حج ادا کرتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے اپنے مشن کے ابتدائی زمانے میں کعبہ کے ساتھ مشرکانہ انسلاک سے منہ موڑتے ہوئے مسلمانوں کو اہل الکتاب کے مقدس شہر کی طرف منہ کر کے صلوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت کی۔ یہ امر عربوں کو وحدانیت پرست خاندان میں شامل کرنے کی آپ ﷺ کی خواہش کا اظہار کرتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ کے پیروکاروں کی تعداد بہت ہی کم تھی اور آخرکار کوئی ستر کے لگ بھگ خاندانوں نے اسلام قبول کیا۔ پہلے پہل تو مکہ کے سب سے زیادہ طاقتور افراد نے مسلمانوں کو نظرانداز کیا تاہم 616ء تک وہ حضرت محمد ﷺ سے بہت ناراض ہو چکے تھے۔

انہیں اس امر پر خاص طور پر فکر لاحق تھی کہ قرآن کے اس عقیدے نے ان کی ہلاکت انگیز سرمایہ داری کے عین سر پر ضرب لگائی تھی۔ عربوں کو تنبیہہ کی گئی تھی کہ یوم آخران کے قبیلے کی دولت اور طاقت ان کے کام نہیں آئے گی بلکہ ہر فرد کو اس کے اعمال کی جزاوسزا ملے گی یعنی ان سے جواب طلبی ہو گی کہ انہوں نے غریبوں کی مدد کیوں نہیں کی؟ انہوں نے اپنی دولت تقسیم کرنے کی بجائے جمع کیوں کی؟ نئے مکہ میں خوش اسلوبی سے کام کرنے والے قریش اس انداز کی باتوں کو خوش دلی سے نہیں سن سکتے تھے لہٰذا ابوالحکم کی قیادت میں مخالفت فروغ پانے لگی (اسے قرآن میں ابوجہل کہا گیا ہے) اس کے ساتھ ایک انتہائی ذہین انسان ابوسفیان' جو کبھی حضرت محمد ﷺ کا ذاتی دوست رہا تھا' اور ایک کٹر بت پرست سہیل ابن عمر تھے۔ وہ اپنے آباؤاجداد کا عقیدہ ترک کر دینے کے تصور اور اپنے رشتہ داروں کے اسلام قبول کرنے سے گڑبڑائے ہوئے تھے اور خوف زدہ تھے کہ حضرت محمد ﷺ مکہ کی سرداری حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرآن نے زور دے کر کہا کہ حضرت محمد ﷺ کا کوئی سیاسی کردار نہیں ہے بلکہ وہ تو بس ایک ''نذیر'' (تنبیہہ کرنے والے)[8] ہیں تاہم وہ سوچتے تھے کہ

ایسا شخص کتنی مدت ان جیسے فانی انسانوں کی حکمرانی قبول کرے گا جس کا دعویٰ ہو کہ اسے اللہ کی طرف سے احکامات موصول ہوتے ہیں۔

تعلقات سخت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ ابوجہل نے حضرت محمد ﷺ اور ان کے رفقاء کا بائیکاٹ کر دیا۔

چنانچہ حضرت محمد ﷺ یثرب کے سرداروں کے ایک وفد سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یثرب مکہ سے قریباً دوسو پچاس میل دوری پر واقع ایک زرعی شہر تھا۔ کافی تعداد میں بدو قبیلوں نے بدوی طرز زندگی کو خیر باد کہہ کر اس شہر میں رہائش اختیار کر لی تھی تاہم صحراؤں میں صدیوں سے لڑی جانے والی جنگوں کے بعد باہمی طور پر امن وامان کے ساتھ رہائش رکھنا ناممکن تھا۔ اس شہر کی ساری آبادی پر ایک کے بعد ایک جاگیرداروں کا کڑا تسلط رہا تھا۔ ان قبیلوں میں سے کچھ قبیلوں نے یہودیت قبول کر لی تھی یا وہ یہودی النسل تھے' اسی لیے یثرب کے لوگ وحدانیت کے تصور سے مانوس تھے۔ اہل یثرب شرک کے شکنجے میں جکڑے ہوئے نہیں تھے اور ایک ایسے نئے عقیدے کی تلاش میں تھے جس کے تحت وہ سب ایک برادری کے طور پر مل جل کر رہ پائیں۔ 620ء میں حج کے دوران حضرت محمد ﷺ سے ملاقات کرنے والا اہل یثرب کا وفد مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا کہ دونوں فریق آپس میں لڑائی نہیں کریں گے اور مشترکہ دشمن کے خلاف ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔ آخرکار 622ء میں مسلمان خاندانوں نے ایک ایک کر کے یثرب کی طرف ہجرت کی۔ حضرت محمد ﷺ کو' جن کا ولی حال ہی میں وفات پا گیا تھا' حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ ہجرت کرنے سے قبل قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن آپ ﷺ اس سے بال بال بچ نکلے تھے۔

ہجرت کو اسلامی سن کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا کیونکہ اسی مرحلے کے بعد حضرت محمد ﷺ قرآنی مثالئے (آئیڈیل) کو مکمل طور پر نافذ کرنے کے قابل ہوئے تھے اور اسلام تاریخ میں ایک اہم عامل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ہجرت ایک انقلابی اقدام تھی۔ ہجرت محض مقام کی تبدیلی ہی نہیں تھی۔ اسلام کی آمد سے پہلے عرب میں قبیلہ ایک مقدس مقام کا حامل ہوتا تھا۔ اپنے ہم نسل رشتہ داروں سے منہ موڑنا اور کسی دوسرے کے ساتھ رشتہ قائم کر لینا کبھی سنا بھی نہیں گیا تھا۔ اس عمل کو بنیادی طور پر توہین آمیز سمجھا جاتا تھا اور قریش بھی تعلق توڑنے کے اس عمل کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے یثرب سے امت کو بے

دخل کروانے کا عہد کر لیا۔ حضرت محمد ﷺ قبائلی گروہوں کے ایک ایسے اتحاد کے سربراہ بن چکے تھے جو خون یا نسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ مشترکہ نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ یہ ایک ایسا امر تھا جو عرب معاشرے میں تحیر انگیز تھا۔ قرآن کے دین کو قبول کرنے کے لئے کسی پر جبر نہیں کیا گیا تھا۔ اس غیر معمولی ''قبیلۂ اعظم'' کی خبریں ہر طرف پھیل گئیں اور یوں تو یہ اس کا آغاز ہی تھا تاہم کسی کو بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اس کے پاس بقا کا کوئی موقع ہے اور یہ اتنا اثر انگیز ثابت ہوگا کہ ہجرت کے صرف دس سال بعد ہی 632ء میں حضرت محمد ﷺ کے وصال فرمانے سے پہلے پہلے عرب میں امن قائم کر دے گا۔

یثرب کو بعد میں مدینہ (بمعنی شہر) کے نام سے مشہور ہونا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کامل اسلامی معاشرے کا ایک نمونہ بن گیا تھا۔ جب حضرت محمد ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک سادہ سی مسجد تعمیر کروائی۔ وہ شان و شوکت سے بے نیاز ایک عمارت تھی جو اسلام کی اولین سادگی کی ترجمانی کرتی تھی۔ لکڑی کے شہتیروں سے چھت تیار کی گئی تھی' ایک پتھر قبلہ نما کے طور پر نصب تھا جبکہ حضرت محمد ﷺ ایک درخت کے تنے پر تشریف رکھ کر تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔ مستقبل کی تمام مسجدیں' جہاں تک ممکن ہو' اس نمونے کے مطابق تعمیر ہونا تھیں۔ اس مسجد کا ایک صحن بھی تھا' جس میں اکٹھے ہو کر مسلمان امت کے مذہبی' معاشرتی' سیاسی اور عسکری معاملات و مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ حضرت محمدؐ اور ان کی ازواج مطہرات اسی صحن کے گرد بنے ہوئے حجروں میں رہا کرتے تھے۔ چرچ کے برعکس' جو دنیاوی سرگرمیوں سے الگ تھلگ ہوتا ہے اور فقط عبادت کے لئے ہی مخصوص ہوتا ہے' مسجد میں ہر سرگرمی کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ قرآنی تصور کے مطابق دین و دنیا میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ زندگی کے تمام معاملات حقیقتاً مقدس تھے اور انہیں الوہیت کے دائرے میں لانا پڑتا تھا۔ توحید مقصد تھی یعنی پوری حیات کا ایک متحد برادری میں ڈھل جانا' جو کہ مسلمانوں کو خدائے واحد کی قربت عطا کرے گی۔

حضرت محمد ﷺ کی کثیر ازواجی پر مغرب میں کافی نکتہ چینی کی گئی ہے تاہم مکہ میں حضرت محمد ﷺ نے صرف ایک ہی شادی کی تھی جو کہ حضرت خدیجہؓ سے ہوئی تھی حالانکہ عرب میں کثیر ازواجی کا عام رواج تھا۔ حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ سے عمر میں کافی بڑی تھیں۔ آپؓ کے بطن سے چھ اولادیں ہوئیں جن میں سے صرف چار بیٹیاں زندہ رہیں۔ چونکہ آپ ﷺ نے ایک قبیلۂ اعظم تشکیل دیا تھا اس لئے آپ ﷺ نے اپنے چند قریبی دوستوں کے ہاں

شادیاں کیں، جس کا مقصد ان کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ قائم کرنا تھا۔ آپ ﷺ کو نئی ازواج میں سے حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی حضرت عائشہؓ بہت عزیز تھیں۔ آپ ﷺ نے حضرت عمر بن خطابؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ سے بھی شادی کی۔ آپ ﷺ نے اپنی دو بیٹیوں کی شادیاں حضرت عثمانؓ ابن عفان اور حضرت علی ابن طالبؓ سے کی تھیں۔ آپ ﷺ کی زیادہ تر ازواج مطہرات عمر میں آپ سے بڑی تھیں جو کہ یا تو کسی ولی کے بغیر تھیں یا ان قبیلوں کے سرداروں کی عزیز تھیں جنہوں نے امت سے اتحاد کرلیا تھا۔ ان میں سے کسی کے بطن سے اولاد نہیں ہوئی۔

حضرت محمد ﷺ گھر کے روزمرہ کے چھوٹے موٹے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے، آپ ﷺ اپنے کپڑوں کو خود پیوند لگا لیا کرتے تھے اور اپنی ازواج کی رفاقت کے متمنی رہتے تھے۔ آپ ﷺ جنگی مہمات پر ان میں سے کسی ایک کو ساتھ لے جاتے تھے اور ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور ان کی آراء کو سنجیدگی سے قبول کرتے تھے۔ ایک موقع پر آپ ﷺ کی سب سے زیادہ ذہین زوجہ حضرت اُم سلمیٰؓ نے ایک بغاوت سے بچنے میں مدد کی تھی۔

قرآن مرد اور عورتوں کو یکساں حقوق اور فرائض کے ساتھ اللہ کے سامنے برابر قرار دیتا ہے[9]۔ قرآن نے کثیر ازواجی کی بھی اجازت دی ہے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ مکہ والوں کے خلاف جنگیں لڑنے کی وجہ سے مسلمان شہید ہو رہے تھے اور عورتیں کسی حفاظت کرنے والے سے محروم ہو رہی تھیں تب مردوں کو چار عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی بشرطیکہ وہ سب بیویوں کے ساتھ برابری کا سلوک کریں اور ایک بیوی پر دوسری کو ترجیح بالکل نہیں دیں[10]۔ مدینہ میں اولین امت کی خواتین عوامی زندگی میں مکمل طور پر حصہ لیا کرتی تھیں اور ان میں سے کچھ نے تو عرب روایات کے مطابق مردوں کے شانہ بشانہ جنگوں میں حصہ لیا۔

قرآن میں حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کے قصص بائبل سے مختلف ہیں۔ جب مسجد میں ان قصص والی سورتوں کی تلاوت کی جاتی تو کچھ یہودی مذاق اڑایا کرتے تھے۔ تین بڑے یہودی قبیلوں نے حضرت محمد ﷺ کی فوقیت کا برا منایا، انہوں نے آپ ﷺ کی وہاں آمد سے پہلے ہی ایک مضبوط بلاک بنا لیا تھا اور اب انہیں کمتری کا احساس ہو رہا تھا اور وہ آپ ﷺ سے چھٹکارہ پانا چاہتے تھے۔

تاہم چند چھوٹے قبیلوں کے یہودیوں کا رویہ آپ ﷺ کے ساتھ دوستانہ تھا اور انہوں نے یہودی صحیفوں کے حوالے سے آپ ﷺ کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا۔ آپ ﷺ یہ سن کر خاص طور پر خوش ہوئے کہ کتابِ پیدائش میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے حضرت ہاجرہؑ

کے بطن سے دو بیٹے تھے: حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ۔ حضرت ابراہیمؑ کو مجبور کیا گیا کہ وہ حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو ایک صحرا میں چھوڑ دیں تاہم خدا نے انہیں بچا لیا اور وعدہ کیا کہ حضرت اسمٰعیلؑ بھی ایک عظیم قوم یعنی عربوں کے باپ ہوں گے[11]۔ مقامی روایت کے مطابق حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ مکہ میں آباد ہو گئے تھے' حضرت ابراہیمؑ وہاں ان سے ملے اور انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا[12] (جسے اصل میں حضرت آدمؑ نے تعمیر کیا تھا مگر جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر منہدم ہو گیا تھا)

624ء تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ مدینہ کے زیادہ تر یہودی حضرت محمد ﷺ سے مصالحت نہیں کریں گے۔

جنوری 624ء میں آپ ﷺ نے ایک ایسا اقدام کیا جو آپ ﷺ کے انتہائی تخلیقی اشاروں میں سے ایک ہے۔ صلوٰۃ کے دوران آپ ﷺ نے جماعت سے فرمایا کہ یروشلم کی سمت رخ کرنے کی بجائے مکہ کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کریں۔ قبلہ کی یہ تبدیلی آزادی کا ایک اعلامیہ تھی۔ یروشلم سے کعبہ کی طرف' جو کہ یہودیت یا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا' رخ پھیر کر مسلمانوں نے واضح طور پر اظہار کیا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی خالص وحدانیت کی طرف رخ کر رہے ہیں جو کہ توریت یا انجیل سے بھی پہلے نیز خدائے واحد کے مذہب کے آپس میں لڑنے والے فرقوں میں بٹ جانے سے بھی پہلے موجود تھی[13]۔ مسلمانوں کو صرف خدائے واحد کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ اللہ کے سوائے انسانوں کے بنائے ہوئے کسی نظام یا کسی مروجہ مذہب کے سامنے جھکنا شرک تھا۔

> بے شک جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے اپنے عقیدے کی وحدت کو توڑ دیا ہے اور فرقوں میں بٹ گئے ہیں ــــ آپ کا ان سے کوئی سروکار نہیں ہے ــــ کہہ دیجئے ''دیکھو' میرے مالک نے مجھے ایک سچے عقیدے کے ذریعے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی دی ہے' ــــ ابراہیمؑ کی طرح' جنہوں نے ہر باطل کو رد کر دیا تھا اور جوان لوگوں میں سے نہیں تھے جنہوں نے اللہ کے علاوہ کسی اور کو معبود بنا لیا تھا۔'' کہہ دیجئے: ''دیکھو' میری نماز اور میری عبادت کے (تمام) طریقے اور میرا جینا اور مرنا صرف خدائے واحد کے لئے ہے۔''[14]

قبلہ کی تبدیلی کو تمام عرب مسلمانوں نے پسند کیا' خاص طور پر مکہ سے ہجرت کر کے

آنے والوں نے تو اس کو بہت پسند کیا۔ اب مسلمان ان یہودیوں اور عیسائیوں کی پیروی نہیں کریں گے جو ان کی آرزوؤں کا مذاق اڑاتے تھے بلکہ اللہ کی طرف جانے والے اپنے سیدھے راستے پر چلیں گے۔

دوسری اہم پیش رفت قبلہ کی تبدیلی کے فوری بعد عمل میں آئی۔ حضرت محمد ﷺ اور مکہ کے مہاجرین کے پاس مدینہ میں روزی کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا' وہاں ان کے کاشت کرنے کے لئے کافی زمین نہیں تھی' بہرصورت وہ کاشت کار نہیں بلکہ تاجر اور کاروباری تھے۔ 624ء میں غزوۂ بدر ہوا' جس میں مسلمانوں نے مکہ والوں کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ اگر چہ مکہ والوں کو تعداد کے لحاظ سے برتری حاصل تھی تاہم ہر قبیلہ الگ الگ اپنے سردار کی کمان میں لڑ رہا تھا۔ دوسری طرف حضرت محمد ﷺ کے سپاہی خوب تربیت یافتہ تھے اور صرف آپ ﷺ کی ہی کمان میں لڑ رہے تھے۔ مکہ والوں کی اس شکست نے بدو قبیلوں کو متاثر کیا اور وہ طاقتور قریش کی ذلت سے بہت لطف اندوز ہوئے۔

پھر وہاں امت کے مایوسی بھرے ایام رونما ہوئے۔ مدینہ میں حضرت محمد ﷺ کو کچھ مشرکین کی عداوت کا سامنا تھا جو نووارد مسلمانوں کے اقتدار کو نہیں مانتے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو شہر سے نکالنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کو مکہ سے بھی نمٹنا تھا اب جہاں ابوسفیان آپ ﷺ کے خلاف مہم چلا رہا تھا اور مدینہ کے مسلمانوں پر دو مرتبہ حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس کا مقصد نہ صرف امت کو جنگ میں شکست دینا تھا بلکہ وہ تمام مسلمانوں کو ہی نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ صحرا کی سفاک اقدار کا مطلب تھا کہ جنگ میں ادھورے اقدامات نہیں اٹھائے جاتے یعنی اگر ممکن ہو تو فاتح سردار سے توقع ہوتی تھی کہ وہ دشمن کو نیست و نابود کر دے گا۔ اس لئے امت کو مکمل تباہی کا خطرہ درپیش تھا۔ 625ء میں امت کو احد کی جنگ میں شکست اٹھانا پڑی تاہم دو برس بعد مسلمانوں نے جنگ خندق میں مشرکین کو بری طرح شکست دی۔ اس جنگ کو جنگِ خندق اس لیے کہتے ہیں کیونکہ مدینہ کی حفاظت کے لئے حضرت محمد ﷺ نے شہر کے اردگرد ایک خندق کھدوا دی تھی۔ قریش تعداد میں مسلمانوں سے بہت زیادہ تھے یعنی تین ہزار مسلمانوں کے مقابلے میں مشرکین کی تعداد دس ہزار تھی۔ لیکن وہ اس نئی جنگی چال سے چکرا کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے تو اس کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں تھا۔ تعداد میں برتر قریش پر حضرت محمد ﷺ کی یہ دوسری فتح فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔ بدو قبیلوں نے سمجھ لیا کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھیوں کا ستارہ بام عروج پر ہے اور قریش کا سورج گہنا رہا

ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جن دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے وہ ان کی مدد نہیں کر رہے تھے۔ بہت سے قبیلے امت سے اتحاد کرنے کے خواہاں تھے اور حضرت محمد ﷺ نے ایک طاقتور قبائلی کنفیڈریشن تشکیل دینا شروع کر دی تھا جس کے رکن ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے اور دشمن کے خلاف مل کر لڑنے کا حلف اٹھاتے تھے۔ کچھ مکہ والے بھی الگ ہو کر مدینہ کو ہجرت کرنا شروع ہو گئے۔ آخرکار حضرت محمد ﷺ پانچ سال تک شدید خطرات کا سامنا کرنے کے بعد مطمئن ہوئے کہ اب امت کی بقا کو کوئی خدشہ لاحق نہیں ہے۔

مدینہ میں مسلمانوں کی اس کامیابی سے سب سے زیادہ یہودی قبیلے بنوقینقع، بنونضیر اور بنوقریظہ متاثر ہوئے جنہوں نے حضرت محمد ﷺ کو تباہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ (نعوذ باللہ) انہوں نے مکہ والوں کے ساتھ اتحاد قائم کر رکھے تھے۔ ان کے پاس طاقتور افواج تھیں اور وہ واضح طور پر مسلمانوں کے لئے خطرے کا باعث تھے کیونکہ ان کا علاقہ ایسا تھا کہ وہ مکہ والوں کی فوج کے ساتھ مل کر آسانی سے مدینہ کا محاصرہ کر سکتے تھے یا عقب سے امت پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ جب 625ء میں بنوقینقع نے حضرت محمد ﷺ کے خلاف ایک ناکام بغاوت کی تو انہیں عرب روایات کے مطابق مدینہ سے باہر نکال دیا گیا۔ حضرت محمد ﷺ نے بنونضیر کے ساتھ مصالحت کی کوششیں کیں اور ان کے ساتھ ایک خصوصی معاہدہ کیا تاہم جب انہیں پتا چلا کہ وہ آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازشیں کر رہے ہیں تو انہیں بھی شہر بدر کر دیا گیا اور وہ نزدیکی یہودی آبادی خیبر میں جا بسے اور شمالی عرب کے قبائل میں ابوسفیان کی حمایت پیدا کرنے کے لئے کام کرنے لگے۔ بنونضیر مدینہ سے باہر زیادہ خطرناک ثابت ہوئے پس جب بنوقریظہ نے جنگ خندق میں مکہ والوں کا ساتھ دیا اور اس جنگ میں ایک موقع پر مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوا تھا تو اس مرتبہ حضرت محمد ﷺ نے کوئی رعایت نہیں دی۔

مسلمان نیست و نابود ہونے سے بال بال بچے تھے اور اگر حضرت محمد ﷺ بنوقریظہ کو فقط جلاوطن کر دیتے تو وہ خیبر میں یہودی مخالفت کو ابھارتے اور امت پر ایک اور جنگ مسلط کر دیتے۔ ساتویں صدی کے عرب میں کسی عرب سے بنوقریظہ جیسے غداروں کے ساتھ رحم دلی کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ اس سخت گیری کا فائدہ یہ ہوا کہ خیبر والوں کو کڑا پیغام ملا اور مدینہ میں موجود دشمن مشرکین پر دباؤ قائم ہوا کیونکہ مشرکوں کے سردار باغی یہودیوں کے اتحادی رہے تھے۔ وہ ایک زندگی اور موت کی جدوجہد تھی اور ہر شخص کو پتا تھا کہ سب کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی کاوشوں کا رخ عمومی طور پر یہودیوں کے خلاف معاندانہ نہیں تھا

بلکہ صرف تین باغی قبیلے ہی ان کا نشانہ تھے۔ قرآن یہودی پیغمبروں کا احترام کرتا ہے اور مسلمانوں پر زور دیتا ہے کہ اہل کتاب کی عزت و تکریم کی جائے۔ آپ ﷺ نے یہودیوں کے چھوٹے گروپوں کو مدینہ میں بسنے کی اجازت دی ہوئی تھی اور بعدازاں اسلامی سلطنتوں میں یہودی بھی عیسائیوں کی طرح مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ رہے۔ سامی دشمنی تو عیسائی لعنت ہے۔ مسلمانوں میں یہودیوں سے نفرت صرف اس وقت پیدا ہوئی جب 1948ء میں اسرائیل کی ریاست وجود میں آئی اور عرب فلسطین سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بنو قریضہ کے خلاف سخت گیری کو حضرت محمد ﷺ جتنا جلد ممکن ہو ختم کرنا چاہتے تھے۔ قرآن درس دیتا ہے کہ جنگ ایک ایسی المناک صورتحال ہے کہ مسلمانوں کو امن کی بحالی کے لئے اپنی پوری قوت استعمال کرنی چاہیے اور جتنے مختصر وقت میں ممکن ہو معمول کی صورت حال کو بحال کرنا چاہیے۔[۱۵] دوسری طرف حقیقت یہ تھی کہ تشدد اور جارحیت عرب معاشرے کے خمیر میں شامل تھی اور امت کو اپنے انداز سے امن کے لئے لڑنا تھا۔ حضرت محمد ﷺ جزیرہ نما میں جس قسم کی بڑی سماجی تبدیلی کو لانے کی کوششیں کر رہے تھے ویسی تبدیلی کو خون بہائے بغیر شاذونادر ہی لایا جا سکتا ہے۔ تاہم جنگ خندق کے بعد جب حضرت محمد ﷺ نے مکہ والوں کو نیچا دکھا دیا اور مدینہ میں موجود عداوتوں کو دبا دیا تو آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ اب جہاد کو ترک کرنے اور امن کی جدوجہد کو شروع کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ مارچ 628ء میں آپ ﷺ نے جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے ایک جرأت مندانہ پیش قدمی کے تسلسل کی شروعات کی۔ آپ ﷺ نے اعلان کیا کہ آپ ﷺ حج ادا کرنے کے لئے مکہ جائیں گے اور اس سفر میں اپنے ساتھ جانے کے لئے رضا کاروں کو طلب کیا۔ چونکہ حج کرنے والوں کے ہتھیار اٹھانے پر پابندی تھی اس لئے یہ عمل مسلمانوں کے لئے شیر کے غار میں داخل ہونے کے مترادف ہوتا اور انہیں سفاک اور معاند قریش کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔ اس خطرے کی حقیقت کو جانتے ہوئے بھی ایک ہزار مسلمان حضرت محمد ﷺ کے ساتھ مکہ جانے پر رضامند ہو گئے۔ انہوں نے حج کے روایتی سفید لباس (احرام) میں سفر کا آغاز کیا۔ اگر قریش عربوں کو کعبہ تک پہنچنے سے روکتے یا نیک نیت حاجیوں پر حملہ کرتے تو وہ اس زیارت گاہ کے سرپرست کی حیثیت سے اپنے مقدس فریضے سے روگردانی کے مرتکب ہوتے۔ تاہم قریش نے ان زائرین پر شہر کے باہر اس مقام تک، جہاں تشدد ممنوع تھا، پہنچنے سے پہلے ہی حملہ کرنے کے لئے فوجی دستے بھیج دیئے۔ تاہم رسول کریم ﷺ ان سے بچتے ہوئے اور اپنے بدو اتحادیوں کی معاونت سے مقدس

شہر کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر قیام پذیر ہو گئے اور مزید پیش رفتوں کا انتظار کرنے لگے۔ امن کے اس مظاہرے پر آخرکار قریش کو مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کرنا پڑا۔ یہ اقدام دونوں فریقین میں غیر مقبول تھا۔ بہت سے مسلمان عملی اقدام کرنا چاہتے تھے تاہم حضرت محمد ﷺ پرامن طریقوں سے فتح حاصل کرنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔

حدیبیہ ایک اور موڑ تھا۔ اس نے مزید بدوؤں کو متاثر کیا اور اسلام قبول کرنے کا رجحان اب ایک ناقابل تنسیخ رجحان بن گیا۔ آخرکار 630ء میں قریش نے رسول کریم ﷺ کے ایک اتحادی قبیلے پر حملہ کر کے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی؛ جس کے نتیجے میں حضرت محمد ﷺ دس ہزار افراد کے ایک لشکر کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس عظیم فوج کو سامنے پا کر عملیت پسند قریش نے رونما ہونے والی حقیقت کا پیشگی ادراک کر لیا اور شکست تسلیم کرتے ہوئے شہر کے دروازے کھول دیے اور اس طرح حضرت محمد ﷺ نے خون کا ایک بھی قطرہ بہائے بغیر مکہ کو فتح کر لیا۔ آپ ﷺ نے کعبہ میں نصب بتوں کو توڑ دیا اور اسے خدائے واحد اللہ سے منسوب کیا۔

قریش کے کسی فرد پر اسلام قبول کرنے کے لئے جبر نہیں کیا گیا تاہم حضرت محمد ﷺ کی فتح نے آپ ﷺ کے ابوسفیان جیسے چند انتہائی شدید دشمنوں کو بھی قائل کر لیا کہ قدیم مذہب ناکام ہو چکا ہے۔ جب حضرت محمد ﷺ 632ء میں وصال فرما گئے تو عرب کے تمام قبیلے یا تو مشرف بہ اسلام ہو کر یا اتحادی کے طور پر امت میں شامل ہو چکے تھے۔ چونکہ امت کے افراد پر ایک دوسرے سے لڑنا منع تھا اس لئے انتقام در انتقام کی قبائلی خونریزی اختتام کو پہنچ گئی۔ حضرت محمد ﷺ نے اکیلے ہی پورے عرب میں امن قائم کر دیا تھا۔

✿ ✿ ✿ ✿

خلفائے راشدینؓ

(632ء-661ء)

حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور کارنامے' مسلمانوں کے روحانی' سیاسی اور نسلی وژن پر ہمیشہ ہمیشہ اثر انداز رہیں گے۔ وہ کارنامے ''نجات'' کے اسلامی تجربے میں ظاہر ہوئے تھے جو کہ حضرت آدمؑ کی '' اولین لغزش'' اور ابدی زندگی میں داخلے کے تصورات ِ نجات پر مشتمل نہیں تھا بلکہ یہ تجربہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی صورت میں ظاہر ہوا تھا جہاں نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی دی گئی ہدایات پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو قبل از اسلام کے عرب کی جہنم جیسی صورتحال سے نجات دلائی تھی۔ وہ کامل رضامندی کے ساتھ واحد اللہ کے حضور سر تسلیم خم کر سکتے تھے اور ان کا فقط یہی عمل انہیں سکون اور طمانیتِ قلب عطا کر سکتا تھا۔ حضرت محمد ﷺ اللہ کے حضور اس کامل سپردگی کی مثال تھے اور جیسا کہ ہم آئندہ ملاحظہ کریں گے مسلمان اپنی روحانی اور معاشرتی زندگیوں میں اس معیار پر پورا اترنے کی بھرپور کوششیں کیا کرتے تھے۔ حضرت محمد ﷺ کبھی ایک الوہی شخصیت کے طور پر ہی محترم نہیں رہے تھے بلکہ آپ کو تو انسانِ کامل کا درجہ حاصل تھا۔ اللہ کے حضور آپ ﷺ کی سپردگی (Surrender) اس قدر کامل تھی کہ آپ ﷺ نے معاشرے کی قلبِ ماہیئت کر کے رکھ دی اور عربوں کو اس قابل بنایا کہ وہ ہم آہنگی کے ساتھ جئیں۔ لفظ اسلام جس لفظ سے نکلا ہے وہ ہے سلام (یعنی امن) اور اس ابتدائی زمانے میں اسلام نے بھائی چارے اور اتفاق کو حقیقتاً فروغ دیا تھا۔

تاہم حضرت محمد ﷺ نے اس کامیابی کو وحی کے پانے والے کی حیثیت میں حاصل

کیا تھا۔ اللہ آپ ﷺ پر ساری زندگی وحی نازل کرتا رہا جس سے قرآن صورت پذیر ہوا۔ چنانچہ آپ ﷺ کی زندگی ماورائی حقیقت اور مادی دنیا کے تشدد، الجھن پیدا کرنے والے اور پریشان کن واقعات کے درمیان ایک مستقل مکالمے کی ترجمانی کرتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے عوامی اور جاریہ (Current) واقعات کو موضوع بنایا تھا اور سیاست کے لئے الوہی رہنمائی اور نور لے کر آیا تھا۔ تاہم حضرت محمد ﷺ کے جانشین پیغمبر نہیں تھے بلکہ انہیں اپنی انسانی بصیرت پر بھروسہ کرنا تھا۔ وہ کس طرح یقین کر سکتے تھے کہ مسلمان اس مقدس ہدایت پر تخلیقی اور راست انداز میں عمل کریں گے؟ جس امت پر انہوں نے حکومت کرنا تھی وہ مدینہ کی چھوٹی سی برادری سے بہت زیادہ بڑی اور پیچیدہ ہوتی ہوئی برادری تھی۔ مدینہ میں تو ہر کوئی دوسرے کو جانتا تھا اور وہاں کسی قسم کی بیوروکریسی اور دفتروں کی ضرورت نہیں تھی۔ سوال یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ کا نائب (خلیفہ) بہت مختلف حالات میں اولین امت کے جوہر کو کس طرح محفوظ رکھے؟

حضرت محمد ﷺ کی جانشینی کرنے والے پہلے چار خلفاء ان مشکل مسئلوں کو حل کرنے کی آزمائش سے دوچار تھے۔ وہ سب کے سب ایسے لوگ تھے جو رسول کریم ﷺ کے سب سے زیادہ قریبی رفیق تھے اور مکہ اور مدینہ میں نمایاں کردار ادا کر چکے تھے۔ انہیں ''راشدین'' کے لقب سے جانا جاتا ہے یعنی ''ہدایت یافتہ افراد''۔ نیز ان کے دورِ خلافت کو ویسا ہی تشکیلی کہا جاتا ہے جتنا کہ خود رسول کریم ﷺ کے دور کو۔ انہوں نے اس زمانے کے دشوار اور المناک واقعات کو جس انداز سے جانچا مسلمان اسی انداز سے اپنے آپ کا اور اپنی الٰہیات کا تعین کیا کرتے تھے۔

رسول کریم ﷺ کے وصال فرما جانے کے بعد ممتاز مسلمانوں کو فیصلہ کرنا تھا کہ امت کو کون سی شکل اختیار کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو یقین نہ ہو کہ وہاں ایک ''ریاست'' ہونی چاہیے' ایک ایسا نظام حکومت جس کی عرب میں کوئی نظیر نہیں تھی۔ کچھ لوگ یہ خیال کرتے دکھائی پڑتے تھے کہ ہر قبائلی گروپ کو اپنا امام منتخب کر لینا چاہیے۔ تاہم رسول کریم ﷺ کے رفقاء حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے اس بات کی وکالت کی کہ امت کو ضرور بضرور متحد رہنا چاہیے اور اس کا حکمران بھی ایک ہی ہونا چاہیے' جیسا کہ اس پر رسول کریم ﷺ اکیلے حکمرانی کر چکے ہیں۔ کچھ کا یقین تھا کہ حضرت محمد ﷺ چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب آپ ﷺ کے جانشین ہوں۔ حضرت علیؓ آپ ﷺ کے قریب ترین مرد رشتہ

دار تھے۔ عرب میں خون کے رشتے تقدس کے حامل ہوا کرتے تھے اور یہ تصور کیا جاتا تھا کہ سردار کی خصوصی صفات اس کی نسل میں منتقل ہو جاتی ہیں تاہم اگر چہ حضرت علیؓ کی نیک سیرتی مسلمہ تھی اس کے باوجود وہ ہنوز عمر میں کم اور ناتجربہ کار تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کو اکثریتی ووٹوں کے ذریعے حضرت محمد ﷺ کا خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کا دور حکومت (4-632ء) گو کہ مختصر تھا تاہم بہت اہم تھا۔ آپؓ کو زیادہ تر فتنۂ ارتداد کے تدارک کے لئے جنگوں میں الجھنا پڑا جو ایسے مختلف قبیلوں کے خلاف لڑی گئیں جنہوں نے امت سے الگ ہونے اور اپنی سابقہ آزاد حیثیت کو بحال کرنے کی کوششیں کی تھی۔ تاہم اس کو وسیع مذہبی علیحدگی تصور کرنا ایک غلطی ہوگی۔ یہ بغاوتیں مکمل طور پر سیاسی اور معاشی وجوہات کے تحت ہوئی تھیں۔ اسلامی کنفیڈریشن میں داخل ہونے والے اکثر بدو قبیلوں کو حضرت محمد ﷺ کے مذہب کی تفاصیل میں بہت تھوڑی دلچسپی تھی۔ رسول کریم ﷺ نے ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت میں اس چیز کو تسلیم کر لیا تھا کہ آپ نے جو بہت سے اتحاد تشکیل دیئے ہیں وہ خالصتاً سیاسی ہیں۔ یہ عرب صحراؤں کی رسم کے مطابق ایک سردار کا دوسرے سردار کے ساتھ فوجی اشتراک کا معاملہ تھا۔ کچھ سردار سوچ سکتے تھے کہ ان کا معاہدہ صرف حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ہی تھا اور ان کے جانشینوں کے ساتھ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ آپ ﷺ کے وصال فرما جانے کے بعد وہ امت کے قبائل پر حملے کرنے کے لئے آزاد ہیں۔

تاہم یہ بات اہم ہے کہ بہت سے باغی یہ سوچنے پر مائل ہوئے کہ وہ اپنی بغاوت کو مذہبی جواز دے دیں۔ ان باغیوں کے سردار اکثر دعویٰ کرتے تھے کہ وہ پیغمبر ہیں اور انہوں نے قرآن کے مقابلے میں ''وحیاں'' بھی پیش کیں۔ عرب ایک گہرے تجربے سے گزر چکے تھے۔ وہ تجربہ ہمارے جدید مفہوم میں ''مذہبی'' نہیں تھا کیونکہ بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ کوئی نجی (پرائیویٹ) عقیدہ نہیں تھا۔ رسول کریم ﷺ پرانے سانچوں کو توڑ چکے تھے اور عربوں نے پہلی مرتبہ خود کو مستقل اور مضمحل کر دینے والی جنگوں سے آزاد ایک متحد برادری میں شامل پایا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کی مختصر زندگی کے دوران وہ مذہبی تبدیلی کے نتیجے میں صورت پذیر ہونے والے ایک مکمل طور پر مختلف طرزِ حیات کے امکان کی جھلک دیکھ چکے تھے۔ جو کچھ بھی ظہور پذیر ہوا تھا وہ اس قدر حیرت ناک تھا کہ ایسے لوگ بھی جو امت سے الگ ہونے کے خواہش مند تھے فقط پیغمبرانہ انداز میں ہی سوچ سکتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے دانش مندی اور تدبر کے ساتھ بغاوت کی اس لہر کو دبا دیا اور عرب کے اتحاد کو تکمیل بخشی۔ انہوں نے باغیوں کی شکایات کو تخلیقی انداز میں دور کیا اور ایسے لوگوں کے خلاف کوئی سخت کارروائی نہیں کی گئی جو امت میں واپس آ گئے۔

حضرت عمرؓ نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ امت کے لئے ایک نظام (Order) ضروری ہے۔ قانون سے ماورا عناصر کو قابو میں لانا ہو گا اور جو توانائیاں اب تک لوٹ مار کرنے میں ضائع ہوتی رہی تھیں انہیں ایک مشترکہ سرگرمی میں ڈھالنا ہو گا۔ اس مسئلے کا واضح حل یہ تھا کہ ہمسایہ ملکوں کے غیر مسلم لوگوں پر حملے کئے جائیں۔ امت کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے بھی بیرونی سمت میں حملے کرنا ضروری تھا۔ اس سے خلیفہ کا اقتدار بھی مستحکم ہوتا۔ عرب روایتی طور پر بادشاہت کو ناپسند کرتے تھے اور کسی بادشاہ کے طور اطوار والے حکمران کی اطاعت قبول نہ کرتے۔ تاہم وہ کسی جنگی مہم کے دوران میں ایک سردار کے اقتدار کو تسلیم کر لیتے یا اس وقت کسی فرد کی اطاعت قبول کر لیتے جب وہ نئی چراگاہوں کی طرف گامزن ہوتا۔

حضرت عمرؓ کی قیادت میں عرب حیرتناک فتوحات حاصل کرتے ہوئے عراق، شام اور مصر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے قادسیہ کی جنگ (637ء) میں ایرانی فوجوں کو شکست سے دوچار کیا، جس نے ساسانیوں کے دارالحکومت اصفہان کے سقوط کی راہ کشادہ کی۔ جونہی مسلمانوں کو افرادی قوت ملی انہوں نے ایرانی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ بازنطینی سلطنت میں انہیں شدید ترین مزاحمت کا سامنا ہوا اور وہ اناطولیہ میں کوئی علاقہ فتح نہیں کر سکے۔ اس کے باوجود مسلمانوں نے شمالی فلسطین میں جنگِ یرموک میں فتح حاصل کی۔ 638ء میں یروشلم کو فتح کیا اور 641ء میں پورے شام، فلسطین اور مصر کو اپنے تسلط میں لے آئے۔ جہاں تک سیرانیکا کا تعلق ہے تو مسلمان افواج نے شمالی افریقہ پر قبضہ کر لیا۔ جنگِ بدر کے صرف بیس برس کے بعد ہی عرب ایک وسیع سلطنت کے مالک بن گئے تھے۔ یہ توسیع جاری رہی۔ رسول کریم ﷺ کے وصال فرما جانے کے ایک صدی بعد اسلامی سلطنت پیرینیز سے ہمالیہ تک وسعت پا چکی تھی۔ یہ ایک اور معجزہ اور اللہ کی مہربانی دکھائی دیتی تھی۔ اسلام کی آمد سے پہلے عرب ایک حقیر سا گروپ تھے لیکن نہایت مختصر مدت کے اندر انہوں نے دو عالمی سلطنتوں کو بڑی شکستوں سے دوچار کر دیا تھا۔ فتح کے تجربے نے ان کے اس احساس کو تقویت دی کہ ان کے ساتھ کوئی حیرت ناک واقعہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا امت کا فرد ہونا ایک ماورائی تجربہ بن گیا تھا، اس کی

وجہ یہ تھی کہ وہ اس شے سے ماورا تھی جس کو وہ پرانے قبائلی ایام میں جانتے تھے یا جس کا تصور کر سکتے تھے۔ ان کی کامیابی قرآن کے پیغام کی بھی تصدیق تھی جس کا دعویٰ تھا کہ صراط مستقیم پر چلنے والا معاشرہ لازماً خوشحال ہوتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے قوانین سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ دیکھو اللہ کی رضا کو تسلیم کر کے انہیں کیا کچھ حاصل ہو گیا! جب حضرت عیسیٰؑ صلیب پر وصال فرما گئے تو عیسائیوں نے واضح ناکامی اور شکست میں خدا کا مشاہدہ کیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے سیاسی کامیابی کا اپنی زندگیوں میں الوہی موجودگی کے انکشاف کے طور پر تجربہ کیا۔ تاہم اس بات کو واضح کرنا ضروری ہے کہ عربوں کو ''اسلام'' کی قوت نے عرب کے باہر پھیل جانے پر مائل نہیں کیا تھا۔ مغربی لوگ اکثر و بیشتر یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک متشدد اور عسکریت پسند عقیدہ ہے جو تلوار کی نوک پر اپنے محکوم لوگوں سے خود کو منواتا ہے۔ مسلمانوں کی توسیعی جنگوں کی یہ تشریح غلط ہے۔ یہ مہمات مذہبی نہیں تھیں اور حضرت عمرؓ اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ انہیں دنیا کو فتح کرنے کا الوہی مینڈیٹ حاصل ہے۔ حضرت عمرؓ اور ان کے جنگجوؤں کا مقصد تو سراسر عملیت پسندانہ تھا یعنی وہ ایک ایسی سرگرمی چاہتے تھے جو امت کے اتحاد کو محفوظ رکھنے میں مدد دے۔ عرب صدیوں سے اس کوشش میں مصروف تھے کہ جزیرہ نما سے باہر واقع امیر ملکوں پر حملہ کریں۔ اس مرتبہ فرق یہ تھا کہ انہیں قوت کے ایک خلا کا سامنا تھا۔ ایران اور بازنطین کئی عشروں سے آپس میں ایک لمبی اور کمزور کر دینے والی جنگوں کے سلسلے میں الجھے ہوئے تھے۔ دونوں سلطنتیں مضمحل ہو چکی تھیں۔ ایران میں طبقاتی فساد چھڑا ہوا تھا اور سیلابوں نے ملک کی زراعت کو تباہ کر دیا تھا۔ ساسانیوں کے زیادہ تر فوجی عرب نسل کے تھے اور وہ مسلمان حملہ آوروں سے مل گئے تھے۔ بازنطینی صوبوں شام اور شمالی افریقہ کی مقامی آبادی یونانی آرتھوڈوکس انتظامیہ کی عدم رواداری کے ہاتھوں نالاں تھی اور جب عربوں نے حملہ کیا تو وہ اس انتظامیہ کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھے۔ یہ الگ بات کہ مسلمان بازنطینی سلطنت میں آگے نہیں جا سکے تھے۔

بعد میں جب مسلمانوں نے اپنی عظیم سلطنت قائم کر لی تو اسلامی قانون نے ان فتوحات کو ایک مذہبی تعبیر دی اور دنیا کو دارالسلام اور دارالحرب میں بانٹ دیا تاہم عملی طور پر مسلمانوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ اب اپنی توسیع کی حد کو پہنچ چکے ہیں اور غیر مسلم دنیا کے ساتھ پرامن اور دوستانہ طور پر رہنے لگے۔ قرآن جنگ و جدل کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے برعکس قرآن اعلیٰ اقدار کی حفاظت کے لئے اپنے دفاع کی منصفانہ جنگ لڑنے کا تصور پیش کرتا ہے

اور قتل و غارت گری اور جارحیت کی مذمت کرتا ہے[19]۔ مزید برآں جب عربوں نے جزیرہ نما سے باہر نکل کر دیکھا تو انہیں پتا چلا کہ لگ بھگ ہر شخص اہل الکتاب میں سے ہے اور انہیں بھی خدا کا مصدقہ صحیفہ موصول ہو چکا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا اور آٹھویں صدی کے وسط تک تبدیلیٔ مذہب کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ اسلام حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے لئے نازل ہوا ہے جیسا کہ یہودیت حضرت اسحٰقؑ کی اولاد کے لئے نازل ہوئی تھی۔ عرب قبائلی ہمیشہ کمزور لوگوں (موالیوں) کا تحفظ کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہودی، عیسائی اور زرتشتی (آتش پرست) ان کی نئی سلطنت میں ذمی بن چکے تھے اس لئے ان پر کسی بھی طور پر حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عربوں میں اس بات کو عزت اور وقار کی علامت مانا جاتا تھا کہ اپنے زیر حفاظت لوگوں سے اچھا برتاؤ روا رکھا جائے، ان کی مدد کی جائے اور اگر انہیں کوئی نقصان پہنچائے تو ان کی طرف سے انتقام لیا جائے۔ فوجی تحفظ کے عوض ذمی ایک ٹیکس (جزیہ) ادا کرتے تھے۔ انہیں اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ مذہبی آزادی کا حکم قرآن میں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عیسائیوں نے، جنہیں یونانی آرتھوڈوکس عیسائیوں نے بدعتی عقائد رکھنے پر سزائیں دی تھیں، مسلمانوں کی حکمرانی کو بازنطینی حکومت پر بھرپور ترجیح دی۔

حضرت عمرؓ نے اچھا نظم و ضبط قائم رکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ عرب فوجیوں کو فتح کے ثمرات سے لطف اندوز ہونے کا کوئی موقع نہیں دیا گیا تھا۔ مفتوحہ زمینیں جرنلوں میں تقسیم نہیں کی جاتی تھیں بلکہ وہ سابقہ کاشت کاروں کے پاس ہی رہنے دی جاتی تھیں، جو مسلم ریاست کو لگان ادا کیا کرتے تھے۔ اس کے بجائے فوجیوں کے لئے نئے ''عسکری شہر'' (امصار) عسکری اہمیت کے حامل مقامات پر آباد کئے گئے۔ ایسے نئے ''عسکری شہروں'' میں عراق میں کوفہ، شام میں بصرہ، ایران میں قم اور مصر میں دریائے نیل کے دہانے پر فسطاط شامل ہیں۔ دمشق واحد قدیم شہر تھا جو ایک اسلامی مرکز بن گیا ایسے ہر شہر میں ایک مسجد تعمیر کی گئی، جہاں مسلمان فوجی نمازِ جمعہ ادا کیا کرتے تھے۔ ان عسکری شہروں میں فوجیوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کا درس دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے خاندانی اقدار کو اہمیت دی۔ وہ شراب نوشی کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے رسول کریم ﷺ کی زاہدانہ صفات کو اجاگر کیا جنہوں نے خود خلیفہ کے مانند ہمیشہ سادگی کے ساتھ زندگی گزاری تھی۔ تاہم وہ عسکری شہر عربوں کی ایسی روایات کے بھی حامل تھے جو قرآنی تصورِ حیات سے ہم آہنگ تھیں۔ ایسی

روایات کو ان اجنبی ملکوں میں بھی جاری رکھا گیا۔ اس وقت تک اسلام بنیادی طور پر ایک عرب مذہب تھا۔ جو ذمی اسلام قبول کر لیتا اسے کسی نہ کسی عرب قبیلے میں شامل کر دیا جاتا اور وہ عرب نظام میں جذب ہو جاتا۔

تاہم فتح کا یہ دور اس وقت یک لخت اختتام کو پہنچ گیا جب 644ء میں حضرت عمرؓ کو مدینہ کی مسجد میں ایک ایرانی جنگی قیدی نے شہید کر دیا۔ خلفائے راشدین کا آخری زمانہ تشدد سے عبارت ہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کو رسول کریم ﷺ کے چھ رفقا نے تیسرا خلیفہ منتخب کیا۔ ان کی خلافت کے ابتدائی چھ برسوں میں امت کی خوشحالی کا عمل جاری رہا۔ حضرت عثمانؓ نے اچھے طریقے سے انتظام سنبھالا اور مسلمانوں نے نئے علاقوں کو فتح کیا۔ انہوں نے بازنطینیوں سے قبرص چھین لیا اور بالآخر انہیں مغربی بحیرۂ روم کے علاقے سے نکال باہر کیا جبکہ شمالی افریقہ میں مسلم افواج تریپولی تک پہنچ گئیں جسے آج کل لیبیا کہا جاتا ہے۔ مشرق میں مسلمان فوجوں نے بیشتر آرمینیا کو فتح کر لیا' کاکیشیا میں داخل ہو گئیں اور ایران کے علاوہ افغانستان میں ہرات تک اور برصغیر میں سندھ تک اسلامی حکومت قائم کر دی۔

تاہم ان فتوحات کے باوجود فوجی غیر مطمئن ہونے لگے۔ وہ ایک زبردست تبدیلی سے گزر چکے تھے۔ صرف دس برسوں کے اندر اندر انہوں نے درشت بدوی ہستی کو ایک پیشہ ور فوج کے بالکل مختلف طرز حیات میں ڈھال لیا تھا۔ وہ گرمیوں کا موسم جنگیں لڑنے اور سردیاں اپنے گھروں سے دور عسکری شہروں میں گزارتے تھے۔ فاصلے اب اتنے وسیع ہو گئے تھے کہ جنگی مہمات بہت زیادہ تھکا دیتی تھیں اور انہیں پہلے سے کم مال غنیمت ملتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے فوجی سالاروں اور مکہ کے امیر خاندانوں کو اب بھی عراق جیسے ملکوں میں نجی جائیدادیں حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی تھی اور اسی وجہ سے وہ غیر مقبول بھی ہو گئے تھے' خاص طور پر کوفہ اور فسطاط میں۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے خاندان بنوامیہ کے افراد کو بہت مؤقر عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ مدینہ والے اس وجہ سے بھی آپؓ سے ناخوش ہو گئے۔ انہوں نے آپؓ پر اقربا پروری کا الزام لگایا حالانکہ اموی خاندان سے تعلق رکھنے والے بہت سے افسران نہایت قابل افراد تھے۔ مثال کے طور پر حضرت عثمانؓ نے حضرت محمد ﷺ کے سابقہ دشمن ابوسفیان کے بیٹے حضرت معاویہؓ کو شام کا گورنر مقرر کیا تھا۔ وہ ایک اچھے مسلمان اور ماہر منتظم تھے' جو اپنے کردار کی پختگی اور معاملہ فہمی کے لئے مشہور تھے۔ تاہم حضرت عثمانؓ کا یہ اقدام مدینہ کے مسلمانوں کو غلط محسوس ہوا' جو اب بھی رسول کریم ﷺ کے انصار (مددگار) کی

حیثیت سے سوچتے تھے کہ ابوسفیان کی اولاد پر انہیں فوقیت دی جانی چاہیے۔قرآن کے حافظ بھی، جو قرآن کی زبانی تلاوت کرتے تھے اور نمایاں مذہبی رہنما بن چکے تھے، حضرت عثمانؓ کے اس فیصلے سے ناخوش تھے کہ مقدس کتاب کا صرف ایک نسخہ ہی عسکری شہروں میں پڑھا جائے جبکہ انہوں نے بہت سے ایسے نسخوں کو ضبط کروالیا جنہیں لوگ ترجیح دیتے تھے مگر ان میں معمولی معمولی فرق موجود تھے۔ وہ غیر مطمئن لوگ رفتہ رفتہ رسول کریم ﷺ کے چچا زاد حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی طرف دیکھنے لگے۔

656ء میں یہ عدم اطمینان ایک بغاوت کی شکل میں نمودار ہوا۔فسطاط سے آنے والے عرب فوجیوں کے ایک گروہ نے حضرت عثمانؓ کے سادہ سے گھر کا محاصرہ کرلیا اور پھر گھر میں داخل ہوکر آپؓ کو شہید کر دیا۔ پھر حضرت علیؓ کے نیا خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

✿ ✿ ✿ ✿

پہلا فتنہ

حضرت علیؓ بظاہر ایک واضح انتخاب نظر آتے تھے۔ وہ رسول کریم ﷺ کے گھر میں پلے بڑھے تھے اور حضرت محمد ﷺ کے آدرشوں کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ ایک اچھے فوجی تھے اور انہوں نے اپنے افسروں کو متاثر کن خطوط لکھے جو کہ اب بھی اسلامی کلاسیکی متن شمار ہوتے ہیں اور جن میں عدل کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے نیز رعایا کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ تاہم رسول کریم ﷺ سے ان کی قرابت داری کے باوجود ان کی حکمرانی کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا گیا۔ مدینہ کے انصار اور امویوں کے عروج پر مشتعل مکہ والے حضرت علیؓ کی حمایت کر رہے تھے۔ انہیں ایسے مسلمانوں کی حمایت بھی حاصل تھی جو اب بھی بدوی زندگی گزار رہے تھے، خصوصاً عراق میں، جس کا عسکری شہر کوفہ حضرت علیؓ کا مضبوط گڑھ تھا۔ تاہم حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کی طرح حضرت محمد ﷺ کے داماد تھے اور اولین اسلام قبول کرنے والوں میں سے ایک تھے، ان کا قتل ایک دل ہلا دینے والا واقعہ تھا جس کے نتیجے میں امت کے اندر پانچ سال تک خانہ جنگی برپا رہی۔ جسے فتنہ کہا جاتا ہے۔

تھوڑا عرصہ انتظار کرنے کے بعد حضرت محمد ﷺ کی زوجۂ محترمہ اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنے رشتہ دار حضرت طلحہؓ اور رسول اکرم ﷺ کے مکہ کے رفقا میں سے ایک حضرت زبیرؓ کے ساتھ مل کر حضرت علیؓ پر حملہ کر دیا کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو سزا کیوں نہ دی۔ چونکہ فوج صوبوں میں تھی اس لیے وہ مدینہ سے بصرہ تک پہنچ گئے۔ حضرت علیؓ ایک مشکل صورتحال سے دوچار تھے۔ خود انہیں بھی حضرت عثمانؓ کی شہادت سے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ ایک مخلص انسان ہونے کے ناطے وہ اس حادثے کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

انہوں نے جنگِ جمل میں دوسرے فریق کو آسانی کے ساتھ شکست دے دی۔ اس کو جنگ جمل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے، جو فوجیوں کے ساتھ

میدانِ جنگ میں موجود تھیں' اپنے اونٹ پر بیٹھ کر جنگ پر نگاہ رکھی تھی۔ حضرت علیؓ نے فتح حاصل کرنے کے بعد اپنے حامیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا' انہیں انعامات سے نوازا تاہم انہوں نے بھی سواد یعنی کوفہ کے گردونواح کی زرخیز زرعی اراضی پر قبضے کی اجازت نہیں دی جس سے ایرانی سلطنت اپنے محاصل کا بیشتر حصہ حاصل کرتی تھی۔

شام میں حضرت علیؓ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا گیا جہاں حضرت معاویہؓ اپنے دارالخلافہ دمشق سے مخالفوں کی راہبری کررہے تھے۔ حضرت عثمانؓ ان کے رشتہ دار تھے اور ان کے بعد وہ اموی خاندان کے نئے سربراہ بنے تھے۔ عرب روایات کے مطابق ایک سردار کی حیثیت سے حضرت عثمانؓ کی شہادت کا انتقام لینا ان کا فریضہ تھا۔ مکہ کے امیر خاندان اور شامی عرب ان کے حامی تھے جو ان کی مضبوط اور دانش مندانہ حکومت کی ستائش کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ کی صورتحال پر ان سے ہمدردی محسوس کی اور ابتداً ان کے خلاف کوئی اقدامات نہیں کیے تاہم رسول کریم ﷺ کے رشتہ داروں اور رفقاء کا ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کرنا بہت پریشان کن امر تھا۔ حضرت محمد ﷺ کا مشن تو یہ تھا کہ مسلمانوں کے مابین اتحاد کو فروغ دیا جائے اور امت کو منتشر نہ ہونے دیا جائے تاکہ یہ اتحاد خدا کی وحدت کی علامت بن جائے۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے دونوں فریقوں نے آئندہ تنازع کے امکان کو رفع کرنے کی غرض سے 657ء میں صفین کے مقام پر معاہدے کے لیے مذاکرات کرنے کی کوشش کی تاہم یہ مذاکرات بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ حضرت معاویہؓ کے حامیوں نے قرآن کو اپنے نیزوں سے باندھ کر بلند کیا اور لڑنے والوں کے مابین صلح کروانے کے لیے غیر جانب دار مسلمانوں سے اللہ کے واسطے ثالثی کرنے کی التجا کی۔ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ثالثی کا فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف تھا اور ان کے کئی پیروکاروں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی وہ اسے تسلیم کرلیں۔ یوں حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کو خلافت سے بے دخل کردیا' عراق پر فوج کشی کی اور یروشلم میں اعلان کیا کہ وہ خود خلیفہ ہیں۔

تاہم حضرت علیؓ کے کچھ سرگرم حامیوں نے ثالثی کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور انہیں حضرت علیؓ کی رضامندی سے دھچکا لگا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی پالیسیوں کی اصلاح میں ناکام ہوکر ناانصافی کے حامیوں کے ساتھ مصالحت کرلی تھی اس لیے وہ بھی ان کے نزدیک پسندیدہ نہیں تھے۔ وہ لوگ امت سے نکل گئے' جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ وہ قرآن سے غداری کررہی ہے اور انہوں نے ایک آزاد کمان دار کی سربراہی میں اپنا

الگ کیمپ قائم کرلیا۔ حضرت علیؓ نے ان انتہاپسندوں کو دبایا' جو ''خارجی'' کے نام سے مشہور ہو گئے تھے اور حقیقی باغیوں کا تو نام ونشان تک مٹا دیا تاہم یہ تحریک ساری سلطنت میں پھیل گئی۔ بہت سے لوگ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت کی اقربا پروری سے نالاں تھے اور قرآن کی مساویانہ روح کا اطلاق چاہتے تھے۔ گوکہ خارجی ہمیشہ ایک اقلیتی گروپ رہے تاہم ان کا مؤقف مضبوط تھا کیونکہ یہ ایک ایسے اہم سیاسی مسلم رجحان کی پہلی مثال تھا جس نے امت کی اخلاقیات کو متاثر کرکے ایک نئی الٰہیاتی پیش رفت کی راہ کشادہ کی۔ خارجیوں کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے حکمران کو سب سے زیادہ طاقت ور نہیں بلکہ سب سے زیادہ مخلص مسلمان ہونا چاہیے اور حضرت معاویہؓ کو خلیفہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ خارجی انتہا پسند تھے تاہم انہوں نے اس مسئلے پر بھی غور کیا کہ کون مسلمان ہے اور کون مسلمان نہیں ہے۔ ایک مذہبی تصور کے طور پر سیاسی قیادت اتنی اہم تھی کہ وہ خدا کی نوعیت' تقدیر اور انسانی آزادی جیسے موضوعات پر بحث ومباحثے کا پیش خیمہ بنی۔

خارجیوں کے ساتھ حضرت علیؓ کے درشت برتاؤ سے ان کی حمایت میں بہت کمی آئی حتیٰ کہ کوفہ میں بھی ان کا یہ رویہ انہیں مہنگا پڑا۔ حضرت معاویہؓ نے بہت فوائد حاصل کیے جبکہ بیشتر عرب غیر جانب دار رہا۔ ایک دوسرے خلیفہ کو منتخب کرنے کے لیے ثالثی کی ایک اور کوشش ناکام ہوگئی۔ حضرت معاویہؓ کی فوج نے عرب میں ان کی خلافت کے خلاف مزاحمت کو دبا دیا اور 661ء میں ایک خارجی نے حضرت علیؓ کو شہید کر دیا اور ان کے باقی ماندہ وفاداروں نے ان کے بیٹے حضرت حسنؓ کے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا تاہم حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ معاہدہ کرلیا اور مدینہ چلے گئے جہاں وہ 669ء میں اپنی وفات تک مقیم رہے۔

اب امت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا اور مسلمانوں کے اتحاد کو بحال کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ اب عراق اور شام کے مسلمان ایک دوسرے کے حریف محسوس ہونے لگے۔ حضرت علیؓ کو ایک ایسا عمدہ اور نیک انسان تصور کیا گیا جنہیں عملی سیاست کی منطق نے شکست دے دی تھی۔

کمسنوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے آدمی اور رسول کریم ﷺ کے قریب ترین مرد رشتہ دار کے قتل کو بجا طور پر ایک سنگین واقعے کے طور پر دیکھا گیا جس نے امت کی اخلاقی مضبوطی کے لیے سنجیدہ مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ عرب کے عمومی عقیدے کے

مطابق حضرت علیؓ کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ انہیں رسول کریم ﷺ کی غیر معمولی صفات میں سے کچھ صفات ورثے میں ملی ہیں اور ان کے بیٹوں کو رہنما مذہبی ہستیاں تصور کیا جاتا تھا۔ حضرت علیؓ...... ایک ایسے انسان جن سے دشمنوں کے علاوہ دوستوں نے بھی دھوکا کیا تھا' کی تقدیر زندگی کی موروثی ناانصافی کی علامت بن گئی تھی۔ جو مسلمان برسر اقتدار خلیفہ کے رویے کے خلاف احتجاج کرتے تھے وہ خارجیوں کی طرح امت سے الگ ہو جایا کرتے تھے اور تمام سچے مسلمانوں کو اعلیٰ ترین اسلامی اقدار کے لیے جہاد کی دعوت دیا کرتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر دعویٰ کرتے کہ وہ شیعانِ علیؓ سے تعلق رکھتے ہیں۔

تاہم دوسرے مسلمانوں نے ایک غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیا۔ وہ ان خونیں تفرقات پر دل گرفتہ تھے جنہوں نے امت کو منتشر کر کے رکھ دیا تھا اور اسی وجہ سے اسلام میں اتحاد ہمیشہ سے بڑھ کر ایک نہایت اہم قدر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ حضرت علیؓ سے غیر مطمئن بہت سے لوگ دیکھ سکتے تھے کہ حضرت معاویہؓ اسلامی مثالئے سے بہت دور ہیں۔ انہوں نے چار خلفائے راشدین کے عہد کو اس انداز سے دیکھنا شروع کیا کہ وہ ایک ایسا دور تھا جس میں رسول کریم ﷺ کے قریب ترین ساتھیوں اور مخلص مسلمانوں نے حکومت کی مگر جن کی عظمت کو برے کام کرنے والے لوگوں نے گھٹا دیا۔ پہلے فتنے کے واقعات علامتی حیثیت اختیار کر گئے اور جب رقیب گروہ اپنے اسلامی مشاورت کے شعور کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے تو ان الم ناک واقعات سے متاثر ہوتے۔ تاہم سب اس امر پر متفق تھے کہ رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے دارالخلافہ کی مدینہ سے اموی دارالخلافہ دمشق کی طرف منتقلی ایک سیاسی مہم سے سوا معاملہ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اُمت رسول کریم ﷺ کی دنیا سے باہر نکلتی جا رہی ہے اور اپنا حقیقی مقصد کھو رہی ہے۔ اب زیادہ نیک اور ذمہ دار مسلمانوں کو اسے دوبارہ راہِ راست پر لانے کے لیے تدابیر پر غور کرنا تھا۔

حصہ دوم

ارتقا

اموی اور دوسرا فتنہ

حضرت معاویہؓ (80-661ء) سلطنت کے اتحاد کو بحال کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمان فتنے سے ڈرے ہوئے تھے اور انہوں نے اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ اپنے عرب ساتھیوں سے دور اور اندر سے دشمن رعایا میں گھرے ہوئے عسکری شہروں میں وہ بڑی آسانی سے نفرت وعداوت کا شکار بن سکتے ہیں۔ سادہ سی بات تھی کہ وہ ایسی ہولناک خانہ جنگی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مستحکم حکومت کے خواہاں تھے اور حضرت معاویہؓ جو ایک اہل حکمران تھے انہیں ایک مضبوط حکومت فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے عرب مسلمانوں کو آبادی سے دور رکھنے کے حضرت عمرؓ والے نظام کو بحال کیا حالانکہ عرب کے کچھ مسلمان اب بھی اس حق کے لئے احتجاج کر رہے تھے کہ انہیں مقبوضہ ملکوں میں جائیدادیں بنانے کی اجازت دی جائے۔ حضرت معاویہؓ نے اس پابندی کو برقرار ہی رکھا۔ انہوں نے تبدیلیٔ مذہب کی بھی حوصلہ شکنی کی اور ایک اہل انتظامیہ کو تشکیل دیا۔ لہٰذا اسلام فاتح عرب اشرافیہ کا مذہب ہی رہا۔ ابتدا میں تو عربوں کو شاہی حکومت کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور انہیں سابقہ بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں میں خدمات انجام دینے والے غیر مسلموں کی مہارت پر بھروسہ کرنا پڑا تاہم رفتہ رفتہ عربوں نے اعلیٰ عہدوں سے ذمیوں کو بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ اگلی صدی کے دوران اموی خلفاء اسلامی افواج کے فتح کئے ہوئے الگ الگ علاقوں کو ایک متحد سلطنت میں ڈھالنے اور ایک مشترک نظریئے (آئیڈیالوجی) کے تحت چلانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ایک عظیم کارنامہ تھا تاہم دربار فطری طور پر امیروں کی ثقافت اور پر آسائش طرز زندگی کو جنم دینے لگا اور کئی حوالوں سے کسی مقتدر طبقے سے مشابہت اختیار کر گیا۔

اس میں ایک مخمصہ پوشیدہ تھا۔ صدیوں کے تجربے کے بعد پتا چلا ہے کہ ایک مطلق بادشاہت جدیدیت سے پہلے کے زمانے والی زرعی معیشت کی بنیاد پر قائم سلطنت کو چلانے کا مؤثر طریقہ ہوتی تھی نیز وہ عسکری حکمرانی سے زیادہ اطمینان بخش ہوتی تھی، جس میں اکثر کمان دار حصول اقتدار کی جنگیں لڑتے رہتے تھے۔ ہمارے جمہوری عہد میں کسی ایک فرد کو اتنا استحقاق یافتہ قرار دے دینا کہ امیر و غریب یکساں اس کی رعایا ہوں، عجیب سا لگتا ہے تاہم ہمیں اس حقیقت کا ادراک ضرور کرنا چاہئے کہ جمہوریت ایک ایسے صنعتی معاشرے ہی میں پنپ سکتی ہے جس کے پاس اپنے وسائل کو لامحدود طور پر استعمال کرنے کی ٹیکنالوجی ہو۔ مغربی جدیدیت کے ظہور میں آنے سے پہلے جمہوریت کا تصور موجود نہیں تھا۔ جدیدیت سے پہلے کی دنیا میں ایک بادشاہ اتنا طاقتور اور مقتدر ہوتا تھا کہ اس کا کوئی مقابل ہی نہیں تھا، اسے اپنی جنگیں لڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، وہ بڑوں کے جھگڑوں کو نمٹا سکتا تھا اور غریب لوگوں کی وکالت کرنے والوں کی التجاؤں کو بلا جواز نظر انداز کر سکتا تھا۔ بادشاہت کی ترجیح اس قدر مضبوط ہوتی تھی کہ، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، وسیع سلطنت میں مقامی حکمران حقیقی اقتدار کے مالک تو ہوتے تھے لیکن وہ بادشاہ کی خوشامد کرتے تھے اور اس کے غلام ہونے کا اقرار کرتے تھے۔ اموی خلفاء ایک وسیع سلطنت پر حکومت کرتے تھے جو ان کی حکمرانی میں مزید وسعت پاتی رہی۔ یقیناً انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ امن کے تحفظ کے لئے انہیں بھی مطلق بادشاہ بن جانا ہوگا تاہم ایک طرف تو سوال یہ تھا کہ اس کو عرب روایت سے کس طرح جوڑا جائے اور دوسری طرف مسئلہ یہ تھا کہ قرآن کے انقلابی مساوات پسندوں سے کس طرح ہم آہنگی اختیار کی جائے؟

اولین اموی خلفا مطلق بادشاہ نہیں تھے۔ حضرت معاویہؓ نے کسی عرب سردار کے انداز میں ہی حکومت کی تھی۔ عربوں نے کبھی بادشاہت پر بھروسہ نہیں کیا تھا جو ایک ایسے خطے میں موزوں طرز حکومت نہیں تھی جہاں لاتعداد چھوٹے چھوٹے گروہ ناکافی وسائل کے لئے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی سلسلہ وار حکمرانی کا نظام نہیں تھا۔ کیونکہ انہیں ہمیشہ سردار کے طور پر بہترین شخص مطلوب ہوتا تھا۔ تاہم فتنے نے متنازعہ جانشینی کے خطرات کو عیاں کر دیا تھا۔ امویوں کو ''سیکولر'' حکمران تصور کرنا غلط ہو گا۔ حضرت معاویہؓ ایک مذہبی انسان اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انہوں نے قبلۂ اول اور ماضی کے بہت سے عظیم پیغمبروں کے گھر یروشلم کے تقدس کو برقرار رکھا۔ انہوں نے امت کے اتحاد کو محفوظ بنانے کے لئے

بھرپور کام کیا۔ ان کے اقتدار کی بنیاد قرآن کی اس ہدایت پر تھی کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور انہیں آپس میں لڑنا نہیں چاہیئے۔ انہوں نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ذمیوں کی مذہبی آزادی اور شخصی حقوق کا احترام کیا۔ تاہم فتنے کے تجربے نے چند مسلمانوں مثلاً خارجیوں کو یقین دلایا کہ نجی اور عوامی زندگیوں میں اسلام سے مراد اس سے کچھ زیادہ ہے۔

لہٰذا اسلام اور زرعی ریاست کے تقاضوں میں ایک پوشیدہ تنازعہ موجود تھا۔ یہ پوشیدہ تنازعہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد المناک انداز میں واضح ہو گیا۔ انہوں نے جانشینی کو محفوظ کرنے کے لئے پیشگی ادراک کر لیا تھا کہ عرب روایات کو لازماً چھوڑنا ہو گا اور فوت ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے بیٹے یزید اول (83-680ء) کی جانشینی کا انتظام کر لیا۔ تاہم اس پر فوری احتجاج سامنے آ گیا۔ کوفہ میں حضرت علیؓ کے حامیوں نے حضرت علیؓ کے دوسرے بیٹے حسینؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا جو اپنے پیروکاروں اور ان کے بیوی بچوں کے مختصر سے گروہ کے ساتھ مدینہ سے عراق روانہ ہو گئے۔ اسی اثنا میں مقامی اموی گورنر نے کوفہ والوں کو دھمکا کر اپنی حمایت واپس لینے پر آمادہ کر لیا۔ تاہم حضرت حسینؓ بیعت کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ان کو یقین تھا کہ رسول کریم ﷺ کے خانوادے کو سچی اسلامی اقدار کی جستجو میں نکلے ہوئے دیکھ کر امت کو اس کا بنیادی فریضہ یاد آ جائے گا۔ کوفہ کے نزدیک ہی واقع کربلا کے میدان میں انہیں اور ان کے پیروکاروں کو اموی فوجیوں نے گھیر کر شہید کر دیا۔ حضرت حسینؓ اپنے ننھے سے بیٹے کو باہوں میں لئے سب سے آخر میں شہید ہوئے۔ اس المناک موت کا سوگ تمام مسلمان مناتے ہیں تاہم ان لوگوں نے جو اپنے آپ کو شیعان علیؓ کہا کرتے تھے حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد رسول کریم ﷺ کے خانوادے کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کی طرح سانحۂ کربلا بھی شیعہ مسلمانوں کے لئے اس شدید ناانصافی کی علامت بن گیا جو کہ حیات انسانی پر چھائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس سانحے سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ مذہبی احکامات کو سیاست کی درشت دنیا سے ملانا ناممکن تھا جو کہ ہلاکت خیز حد تک اس کے لئے مخاصمانہ دکھائی دیتی تھی۔ بہت زیادہ سنگین بغاوت وہ تھی جو جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے خلاف لڑنے والے ایک صحابی کے بیٹے حضرت عبداللہ ابن الزبیرؓ نے حجاز میں کی۔ یہ اسلام کی پہلی امت کی حقیقی اقدار کی طرف واپسی کی بھی ایک کاوش تھی جس کے تحت کوشش کی گئی کہ اقتدار امویوں سے چھین کر مکہ اور مدینہ میں واپس لے آیا جائے۔ 683ء میں

اموی فوجوں نے مدینہ کو حاصل کر لیا لیکن پہلے یزید اول اور پھر اسی برس اس کے ننھے بیٹے معاویہ ثانی کی موت کی وجہ سے مکہ کا محاصرہ ختم کر دینا پڑا۔ امت ایک بار پھر خانہ جنگی کی وجہ سے منتشر ہو گئی تھی۔ حضرت ابن زبیرؓ کو بہت سے لوگوں نے خلیفہ تسلیم کر لیا تھا۔ تاہم جب 684ء میں خارجی باغیوں نے وسطی عرب میں ایک آزاد ریاست قائم کر لی تو وہ حجاز تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ ادھر عراق اور ایران میں بھی خارجی ابھر چکے تھے' کوفہ میں شیعہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا انتقام لینے اور حضرت علیؓ کے ایک اور بیٹے کی نامزدگی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تمام باغی قرآن کے مساویانہ مثالیوں (آئیڈیلز) کے علمبردار تھے تاہم شامی افواج حضرت معاویہؓ کے ایک اموی چچازاد بھائی مروان اور اس کے بیٹے عبدالملک کے نام پر سرخرو ہوئیں۔ 691ء تک انہوں نے اپنے سارے مخالفوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا تھا اور اگلے ہی برس انہوں نے حضرت ابن زبیرؓ کو شکست دی اور شہید کر دیا۔

عبدالملک (685ء-705ء) امویوں کے اقتدار کو بحال کرنے کی اہلیت رکھتا تھا اور اس کے اقتدار کے آخری بارہ برس پرامن اور خوش حال تھے۔ وہ بھی کوئی مطلق قسم کا بادشاہ نہیں تھا' تاہم دوسرے فتنے کے بعد وہ واضح طور پر مطلق قسم کی بادشاہت کی طرف مائل ہو گیا۔ اس نے مقامی عرب سرداروں کے خلاف امت کے اتحاد کو قائم کیا' باغیوں کو زیر کیا اور مرکزیت کی ایک مضبوط پالیسی پر عمل کیا۔ عربی کی جگہ فارسی سلطنت کی دفتری زبان بن گئی' پہلی مرتبہ اسلامی ٹکسال وجود میں آئی' سکوں پر قرآنی آیات کندہ ہوتی تھیں۔ یروشلم میں 691ء میں پہلی بڑی اسلامی یادگار گنبد صخریٰ مکمل ہو گیا' جو عیسائی اکثریت والے اس مقدس شہر میں اسلام کی برتری کا فخریہ اظہار تھا۔ اس نے واضح کر دیا کہ اسلام باقی رہنے کے لئے آیا ہے۔ اس گنبد کے ساتھ ہی منفرد اسلامی فن تعمیر اور فن کارانہ اسلوب کی بھی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہ فن شبیہوں سے بے نیاز تھا' جو عبادت گزاروں کی توجہ ماورائیت سے ہٹا سکتی تھیں' وہ ماورائیت کہ انسانی تخیل جس کا بھرپور انداز میں اظہار کرنے سے قاصر ہے۔ یہ گنبد' جو اسلامی فن تعمیر کی ایک خصوصیت بن گیا' بذات خود اس روحانی عروج کی نمایاں علامت ہے جس کی ہر مومن آرزو کرتا ہے تاہم یہ توحید کے کامل توازن کا بھی اظہار کرتا ہے۔ اس کا بیرونی حصہ' جو لامتناہی آسمانوں تک پہنچ رہا ہے' اس کی داخلی جہت کا عکاس ہے۔ یہ اس انداز کی ترجمانی کرتا ہے جس کے ذریعے انسان اور الوہی ہستی' داخلی اور خارجی دنیائیں ایک دوسرے کو یوں مکمل کرتی ہیں جیسے وہ واحد اکائی کے دو حصے ہوں۔ مسلمان زیادہ پراعتماد ہوتے جا رہے تھے اور اپنے

منفرد روحانی وژن کا اظہار کرنے کی شروعات کر رہے تھے۔

اس بدلی ہوئی فضا میں وہ سخت قوانین' جو مسلمانوں کو محکوم رعایا سے الگ تھلک رکھتے تھے' آہستہ آہستہ نرم پڑنے لگے۔ عسکری شہروں میں غیر مسلموں نے آباد ہونا شروع کیا' کاشتکار مسلمانوں کے علاقوں میں کام حاصل کرنے لگے اور عربی سیکھنے لگے۔ تاجروں نے مسلمانوں کے ساتھ تجارت شروع کر دی اور اگرچہ تبدیلیٔ مذہب کی اب بھی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی تاہم کچھ درباری افسروں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاہم جونہی یہ علیحدگی ختم ہوئی لوگوں نے عرب مسلمانوں کی مراعات پر ناخوشی کا اظہار شروع کر دیا۔ خارجیوں اور شیعوں پر جبر واستبداد نے برے اثرات قائم کیے۔ عرب اور عسکری شہروں میں ایک نئی اسلامی تحریک شروع ہو گئی جو اسلامی مثالیوں (آئیڈیلز) کے زیادہ سخت اطلاق پر زور دیتی تھی۔ عبدالملک نے ان نئے تصورات میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تاہم اس کا دعویٰ تھا کہ قرآن اس کی پالیسیوں کی تائید کرتا ہے۔ کچھ نئے مذہبی پیشوا قرآن کے زیادہ فعال کردار کے خواہاں تھے اور اس کو محض تائید یا جواز کے طور پر استعمال کرنے کی بجائے اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے پر زور دیتے تھے۔

مذہبی تحریک

خانہ جنگیوں کی وجہ سے بہت سے سنگین مسائل پیدا ہو گئے۔اب سوال یہ ابھرا کہ ایسا معاشرہ جو اپنے اماموں کو قتل کر دیتا ہو یہ دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے کہ خدا نے اس کو ہدایت دی ہے؟ کس قسم کے انسان کو امت کی رہنمائی کرنی چاہیے؟ کیا خلیفہ سب سے زیادہ نیک شخص کو ہونا چاہئے (جیسا کہ خارجی ایمان رکھتے تھے)' رسول کریم ﷺ کے خانوادے سے ہونا چاہئے (جیسا کہ شیعہ یقین رکھتے تھے) یا مومنوں کو امن اور اتحاد قائم رکھنے کے لئے امویوں کو ان کی تمام تر ناکامیوں کے ساتھ قبول کر لینا چاہئے؟ پہلے فتنے کے دوران حضرت علیؓ حق پر تھے یا حضرت معاویہؓ؟ اموی ریاست کیسے اسلامی ہے؟ کیا ایسے حکمران جو اس قدر عیاشانہ زندگی گزاریں اور عوام کی اکثریت کے افلاس کو نظرانداز کر دیں' وہ سچے مسلمان ہو سکتے ہیں؟ اسلام قبول کرنے والے غیر عربوں کی کیا حیثیت ہے جنہیں کسی نہ کسی عرب قبیلے کا موالی بننا پڑتا ہے؟ کیا یہ شاونیت اور عدم مساوات نہیں ہے جو کہ قرآن سے متصادم ہے؟

جیسا کہ ہم جانتے ہیں انہی سیاسی بحث مباحثوں کی وجہ سے اسلام کا مذہب اور نیکی ظہور پذیر ہونا شروع ہوئی۔قرآن کے قاریوں اور دوسرے ذمہ دار لوگوں نے سوال کیا کہ ایک مسلمان ہونے کا حقیقی مطلب کیا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کو پہلے اسلامی اور عرب بعد میں دیکھنا چاہتے تھے۔قرآن کل حیات انسانی کی توحید کی بات کرتا ہے جس کا مطلب ہے کہ فرد کے تمام اعمال اور ریاست کے تمام ادارے اللہ کی رضا کے سامنے اطاعت کا اظہار کریں۔ عیسائیوں نے اپنی تاریخ کے ایک ایسے ہی تشکیلی مرحلے میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت اور فطرت کے بارے میں بحثیں کی تھیں جنہوں نے انہیں خدا' نجات اور انسانی صورتحال کا اپنا منفرد تصور وضع کرنے میں مدد دی تھی۔خانہ جنگیوں کے بعد رونما ہونے والی سیاسی قیادت کے

بارے میں مسلمانوں کے بحث مباحثے نے اسلام میں ایک ایسا کردار ادا کیا جو عیسائیت میں چوتھی اور پانچویں صدی میں ہونے والے عظیم عیسائی مباحثوں کے مترادف ہے۔

اس نئی اسلامی نیکوکاری کا نمونہ اور اعلیٰ ترین مثال حضرت حسن بصریؒ (وفات 728ء) تھے جو مدینہ میں رسول کریم ﷺ کے خانوادے کے قریب ترین حلقوں میں پروان چڑھے تھے اور حضرت عثمانؓ کی شہادت تک وہیں رہے تھے۔ بعد میں وہ بصرہ چلے گئے جہاں انہوں نے ایک روحانی سلسلہ تشکیل دیا جس کی بنیاد دنیاوی اشیاء کی مذمت تھی اور جو رسول کریم ﷺ کے زاہدانہ طرز حیات کی طرف لوٹنے کی تلقین کرتا تھا۔

تاہم حضرت حسن بصریؒ بصرہ میں سب سے زیادہ مشہور مبلغ بن گئے تھے اور ان کا سادہ طرز زندگی دربار کی عیاشی پر ایک بلیغ اور پوشیدہ طور پر کٹیلی تنقید بن گیا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ نے بصرہ میں ایک مذہبی اصلاح کا آغاز کیا اور انہوں نے اپنے پیروکاروں کو قرآن پر گہرا غور وفکر کرنے کا درس دیا۔ انہوں نے کہا کہ خود احتسابی اور اللہ کی رضا کے سامنے کامل اطاعت اختیار کرنا سچی خوشی کا سرچشمہ ہے کیونکہ اس طرح انسانی خواہشات اور مرد وزن کے لئے خدا جو چاہتا ہے اس کے درمیان تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ امویوں کی تائید کرتے تھے تاہم انہوں نے واضح کر دیا تھا کہ جس موقع پر تنقید جائز ہوگی' وہ تنقید ضرور کریں گے۔ آپ قدریہ فلسفے کی طرف مائل تھے۔ انسان آزادارادے کے حامل ہیں اور اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ کسی خاص انداز سے ان کا عمل کرنا پہلے سے مقدر میں نہیں لکھا ہوا ہے کیونکہ خدا عادل ہے اور اگر وہ ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو خدا انہیں نیک زندگی گزارنے کا حکم نہیں دیتا۔ چنانچہ خلفا اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں اور اگر انہوں نے اللہ کی واضح ہدایات سے روگردانی کی تو انہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ جب خلیفہ عبدالملک نے سنا کہ حضرت حسن بصریؒ ایسی ڈھکی چھپی باغیانہ حکمت کو پھیلا رہے ہیں تو اس نے انہیں دربار میں بلا بھیجا تاہم حضرت حسن بصریؒ اتنے مقبول ومعروف تھے کہ اسے انہیں سزا دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔ حضرت حسن بصریؒ نے حکومت کی سیاسی مخالفت کے ساتھ ایک منظم داخلی زندگی کے امتزاج کی مضبوط اسلامی روایت کا آغاز کیا۔

قدریوں نے اس لئے اموی حکمرانی کو قبول کر لیا تھا کیونکہ صرف وہی امت کی وحدت کو محفوظ رکھنے کے قابل نظر آتے تھے۔ وہ خارجیوں کی مخالفت کرتے تھے جو کہتے تھے کہ اموی مرتد ہیں اور موت کے مستحق ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد حضرت واصل بن عطاؒ

(وفات 748ء) نے ان دونوں انتہاؤں سے ''اعتزال'' (علیحدگی) اختیار کرتے ہوئے ایک معتدل مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ معتزلہ قدریوں سے متفق تھے کہ انسان کو آزاد ارادہ عطا ہوا ہے وہ بھی قدریوں کی طرح دربار کے عیاشانہ طرز زندگی کی مذمت کرتے تھے اور انہیں کی طرح مسلمانوں کی مساوات پر زور دیتے تھے۔ تاہم معتزلہ خدا کے عدل پر بے حد زور دیتے تھے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے ساتھ استحصالی برتاؤ روا رکھنے والے مسلمانوں کے شدید ترین ناقد بن گئے۔ سیاسی مسئلے پر انہوں نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین فیصلہ کرنے سے اعتزال اختیار کیا کیونکہ ان کا کہنا تھا صرف خدا ہی جان سکتا ہے کہ انسانوں کے دلوں میں کیا ہے۔ یہ روش خارجیوں کی انتہا پسندی کا توڑ تھی تاہم اس کے باوجود معتزلہ سیاسی طور پر فعال لوگ تھے۔ قرآن مسلمانوں کو تاکید کرتا ہے کہ ''وہ نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں 1۔ اور خارجیوں کی طرح کچھ معتزلہ نے بھی اس ہدایت کو بہت سنجیدگی سے لیا۔ کچھ نے شیعہ باغیوں کی حمایت کی اور بعض نے حضرت حسن بصریؒ کی طرح حکمرانوں کو سرزنش کی جو قرآنی مثالئے (آئیڈیل) کے مطابق زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ معتزلہ عراق کے دانش ورانہ منظر پر ایک صدی تک غالب رہے۔ معتزلہ نے ایک عقلیت پسندانہ الٰہیات کو تشکیل دیا جو مستحکم اتحاد اور خدا کی سادگی پر زور دیتی تھی جس کے بارے میں مفروضہ تھا کہ امت کا اتحاد اسی کی عکاسی کرتا ہے۔

مرجعیوں نے بھی، جو ایک اور مکتب فکر تھا، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین فیصلہ کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کے بقول انسان کا داخلی مزاج ہی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو قرآن کے ساتھ مطابقت کرتے ہوئے فیصلے کو ضرور ''ملتوی'' (ارجع) کر دینا چاہیے۔2۔ چنانچہ امویوں کے بارے میں اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے یا انہیں ناجائز حکمران قرار دے کر مسترد نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کریں تاہم اگر وہ قرآن کے معیارات سے روگردانی کریں تو ان کی سخت سرزنش کی جانی چاہئے۔ اس مکتب فکر کے سب سے زیادہ مشہور مانے والے امام ابوحنیفہؒ (767ء-699ء) ہیں جو کوفہ کے ایک تاجر تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور ایک فقہ کے بنیاد گزار بنے جو اسلام پر بہت بھرپور اثر رکھتا ہے اور اسلامی دنیا میں اعلیٰ تعلیم کا اہم مضمون بن گیا ہے۔ فقہ کی جڑیں خانہ جنگیوں کے بعد ابھرنے والی وسیع بے اطمینانی میں بھی ہیں۔ مرد ایک دوسرے کے گھروں میں

یا مسجدوں میں اکٹھے ہو کر اموی حکومت کی خامیوں پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ وہ اس موضوع پر بحث مباحثہ کرتے کہ معاشرے کو اسلامی اصولوں کے مطابق کس طرح چلایا جا سکتا ہے؟ فقہا ایسے جامع قوانین کے نفاذ کے خواہش مند تھے جو قرآنی احکامات کے مطابق ایک ایسا عادلانہ معاشرہ قائم کر دیں جو ہر اعتبار سے اور کلی طور پر خدا کی رضا کی اطاعت کرتا ہو' یہ کوئی زاہدانہ خواب نہیں بلکہ ایک حقیقی امکان تھا۔ اولین فقہا نے بصرہ' کوفہ' مدینہ اور دمشق میں اپنے اپنے مخصوص علاقے کے لئے ایک قانونی نظام تشکیل دیا۔ ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ قرآن میں جو قوانین ہیں وہ ایک بہت ہی زیادہ سادہ معاشرے کے لئے تھے۔ للہٰذا کچھ فقہا نے احادیث اکٹھا کرنا شروع کر دیں تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا نے کسی خاص صورتحال میں کیا اقدام کیا تھا۔ بعضوں نے اپنے شہر میں سنت کو نقطۂ آغاز کے طور پر لیا اور ابتدائی ایام میں وہاں آباد ہونے والے کسی ساتھی سے اس کا سلسلہ جوڑا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ سچا علم حاصل کر رہے ہیں۔ حضرت ابوحنیفہؒ اموی دور میں قانون کے سب سے بڑے ماہر بن گئے تھے اور انہوں نے ایک فقہی مکتب فکر کی بنیاد رکھی جس کی مسلمان آج بھی پیروی کرتے ہیں۔ انہوں نے خود تو بہت کم لکھا ہے تاہم ان کے شاگردوں نے آنے والی نسلوں کے لئے ان کی تعلیمات کو محفوظ کر لیا۔ بعد میں آنے والے فقہا نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ مختلف نظریات پیش کئے اور نئے مسالک کی بنیاد رکھی۔

ایسے ہی مباحثوں کے حلقوں سے اسلامی تاریخ نویسی ظہور میں آئی۔ مسلمان اپنی جاریہ (Current) مشکلات کا حل رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں تلاش کرنے لگے۔ کیا خلیفہ کو قبیلۂ قریش کا فرد ہونا چاہئے یا انصار کے لئے قابل قبول کسی فرد کی اولاد؟ کیا حضرت محمد ﷺ اس بارے میں کوئی رائے دے چکے ہیں؟ حضرت محمد ﷺ نے جانشینی کے لئے کیا انتظامات کئے تھے؟ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حقیقتاً کیا واقع ہوا تھا؟ محمد ابن اسحاق (وفات 767ء) جیسے تاریخ نویسوں نے ایسی احادیث اکٹھی کرنا شروع کیں جو قرآن کی آیات کو ان تاریخی حالات سے مربوط کریں جن میں رسول کریم ﷺ نے کوئی خاص وحی موصول کی ہو۔ ابن اسحاق نے حضرت محمد ﷺ کی ایک تفصیلی سوانح عمری (سیرت) قلم بند کی جس میں مدینہ والوں کی نیکی اور مکہ والوں کی ناانصافی پر زور دیا گیا ہے۔

وہ واضح طور پر اس شیعہ موقف کی طرف مائل ہیں کہ مسلمانوں کا حکمران ابوسفیان کی اولاد میں سے کسی کو نہیں ہونا چاہئے۔ یوں تاریخ ایک سیاسی سرگرمی بن گئی جو حکومت کی اصولی مخالفت کا جواز مہیا کرتی تھی۔

چنانچہ امت کی سیاسی راستی اسلام کے ظہور پذیر ہوتے ہوئے تقویٰ میں مرکزی اہمیت رکھتی تھی۔ جہاں خلیفہ اور اس کی انتظامیہ زرعی معاشرے سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوشاں تھے اور طاقت ور بادشاہت کو قائم کرنے کی مساعی کر رہے تھے وہاں راسخ العقیدہ مسلمان ایسے کسی حل کی شدید مخالفت کر رہے تھے۔ چنانچہ بہت ابتدائی مرحلے ہی سے حکمران کی پالیسیوں اور رویے نے ایک مذہبی اختصاص حاصل کر لیا تھا جس کا زہد وتقویٰ، تصوف، مقدس فقہ اور اسلامی دنیا کے ابتدائی الٰہیاتی قیاس کے ساتھ گہرا ربط تھا۔

امویوں کا آخری زمانہ

(705ء-750ء)

زیادہ پختہ مسلمانوں کی نامنظوری کے باوجود عبدالملک نے اپنے بیٹے ولید اول کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا انتظام کر ہی لیا۔ یوں پہلی مرتبہ اسلامی دنیا میں بغیر کسی احتجاج کے اولاد کی جانشینی کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ خاندان امیہ اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ ولید کے عہد میں مسلمان افواج نے شمالی افریقہ کی فتح کا سلسلہ جاری رکھا اور سپین میں ایک بادشاہت قائم کی۔ یہ اسلام کی مغربی توسیع کی حد تھی۔ جب 732ء میں چارلس مارٹیل نے پوائٹیرز میں مسلمان فوج کو شکست دی تو اسے مسلمانوں نے کوئی زیادہ بڑا نقصان تصور نہیں کیا۔ مغرب کے لوگ خواہ مخواہ پوائٹیرز کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں جو کہ واٹرلو بہرحال نہیں تھا۔ عربوں نے اسلام کے نام پر مغربی عیسائیت کو فتح کرتے ہوئے مذہبی یا دیگر قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ بہرحال ایسا لگتا ہے کہ یورپ واضح طور پر ان کے لئے بے کشش تھا کیونکہ اس غیر مہذب قسم کے پسماندہ سمندر پار علاقے میں تجارت کے بہت کم مواقع تھے' مال غنیمت کم ملتا اور وہاں کی آب و ہوا خوفناک تھی۔

عمر ثانی (717-20ء) کے عہد اقتدار کے اختتام تک سلطنت مشکلات میں گھر چکی تھی۔ جدیدیت سے پہلے کے دور کی سلطنتوں کی عمر مختصر ہوا کرتی تھی۔ اضافی زرعی پیداوار پر استوار ہونے کی وجہ سے سلطنت کے پھیلاؤ کے ساتھ ایک ایسا مرحلہ آ جاتا تھا کہ وسائل کی قلت ہو جاتی تھی۔ عمر کو قسطنطنیہ فتح کرنے کی تباہ کن کوشش کا خمیازہ بھگتنا پڑا جو نہ صرف ناکام ہو گئی تھی بلکہ جان و مال کا بھاری نقصان بھی اٹھانا پڑا تھا۔ عمر پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے ذمیوں

کی تبدیلیٔ مذہب کی حوصلہ افزائی کی۔ ذمی بھی اس باوقار مذہب کو اپنانے کے مشتاق تھے لیکن چونکہ انہوں نے جزیہ مزید ادا نہیں کرنا تھا اس لئے محاصل میں زبردست کمی واقع ہو گئی۔ عمر ایک دیندار انسان تھے' انہوں نے مدینہ میں پرورش پائی تھی اور وہاں وہ مذہبی تحریک سے متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی' اسلامی اتحاد کے مثالئے پر زور دیا' تمام صوبوں سے مساوی برتاؤ کیا (شامیوں کو ترجیح نہیں دی) اور ذمیوں کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھا۔ وہ بہت مقبول ہو گئے تھے تاہم ان کی اسلامی پالیسیاں' جو کہ متقی لوگوں کو بہت پسند تھیں' کمزور ہوتی ہوئی سلطنت کی معیشت کے لئے ٹھیک نہیں تھیں۔ ان کے جانشین کو مستقل طور پر بغاوتوں اور شدید عدم اطمینان کا سامنا رہا۔ اس سے تھوڑا سا فرق پیدا ہوا کہ آیا خلیفہ یزید ثانی (4-720ء) کی طرح بدچلن ہو یا ہشام اول (43-724ء) کی طرح متقی ہو۔ ہشام ایک مضبوط اور اہل خلیفہ تھا' جس نے سلطنت کی معیشت کو دوبارہ مستحکم بنا دیا تاہم اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ریاست کو زیادہ مرکزیت پسندانہ اور زیادہ آمرانہ بنا دیا۔ وہ کسی روایتی بادشاہ سے بہت زیادہ مماثل ہو گیا تاہم اس سے سلطنت کو سیاسی طور پر فائدہ ہوا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس قسم کا طرز حکومت مخلص مسلمانوں کے لئے ناپسندیدہ تھا اور بنیادی طور پر غیر اسلامی تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا ایک ریاست کو قرآنی اصولوں کے مطابق چلانا ناممکن ہے؟ شیعہ رفتہ رفتہ زیادہ فعال ہونے لگے۔ ان کے رہنما حضرت علیؓ کی نسل سے ہونے کے دعوے دار تھے' ان کا ایمان تھا کہ علم جو مسلمانوں کو ایک عادلانہ معاشرے کے قیام کا اہل بناتا ہے' حضرت محمد ﷺ کے خانوادے میں مکمل طور پر محفوظ ہے اور یہ کہ صرف انہیں کو حکومت کرنی چاہئے۔ زیادہ ریڈیکل شیعہ امت کے موجودہ مسائل کا ذمہ دار پہلے تین خلفائے راشدین (حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ) کو ٹھہراتے تھے' جنہیں چاہئے تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو پہلے قیادت سنبھالنے دیتے۔ کچھ زیادہ انتہا پسند شیعہ (جنہیں غالی کہا جاتا ہے) دوسرے مذاہب کو تبدیل کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور وہ اپنے ساتھ اپنے کچھ پرانے عقائد بھی اسلام میں لے آئے۔ وہ حضرت علیؓ کو الوہی ہستی کی تجسیم تصور کرتے تھے اور ان کا ایمان تھا کہ جن شیعہ رہنماؤں کو قتل کر دیا گیا تھا وہ ''غیبت'' میں تھے اور آخری زمانوں میں عدل اور امن والی یوٹوپیائی سلطنت کو قائم کریں گے۔

مگر صرف مذہبی لوگ ہی اموی حکومت سے الگ تھلگ نہیں تھے۔ مذہب تبدیل کرنے والے (موالی) دوسرے درجے کے افراد قرار پائے تھے۔ عرب مسلمانوں میں قبائلی تقسیمیں موجود تھیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کی خواہش تھی کہ رعایا کے ساتھ ربط قائم کیا جائے اور بعض کی خواہش تھی کہ پرانی توسیعی جنگوں کو جاری رکھا جائے۔ تاہم اسلامی جذبہ اتنا ہمہ گیر ہو چکا تھا کہ ہر باغی گروپ کو مذہبی نظریئے کو اپنانا پڑا تھا۔ جس بغاوت کے نتیجے میں اموی عہد حکومت کا خاتمہ ہوا اس پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ عباسیوں نے اس ہمہ گیر خواہش کو عملی جامہ پہنایا کہ حضرت محمد ﷺ کے خانوادے کے کسی فرد کو تخت نشین ہونا چاہیے اور اپنے رہنما کے بارے میں باصرار کہا کہ وہ رسول کریم ﷺ کے چچا عباسؓ اور ان کے بیٹے عبداللہؓ کی نسل میں سے ہیں، جو اولین قرآن خوانوں میں سب سے ممتاز تھے۔ 743ء میں انہیں ایران میں حمایت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اگست 749ء میں کوفہ کو فتح کیا اور آخری اموی خلیفہ منصور ثانی کو اگلے ہی برس عراق میں شکست دے دی۔ جب عباسی خلفا نے آخرکار سلطنت پر قبضہ کرلیا تو انہوں نے ایک بہت ہی مختلف قسم کے معاشرے کو تشکیل دیا۔

عباسی: خلافتِ عظمیٰ کا دور

(750ء۔935ء)

عباسیوں نے خود کو شیعہ تناظر میں پیش کر کے تائید و حمایت حاصل کی تھی مگر جب وہ اقتدار میں آ گئے تو انہوں نے یہ مذہبی لبادہ اتار دیا اور واضح کر دیا کہ وہ تو خلافت کو روایتی زرعی انداز کی مطلق بادشاہت بنانا چاہتے ہیں۔ پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس السفاح (750-54ء) نے تمام امویوں کو قتل کروا دیا جو اس کے راستے کی رکاوٹ بن سکتے تھے۔ کسی عرب اشرافی خاندان کا بلا امتیاز قتل کر دیا جانا اب تک ناقابلِ تصور رہا تھا۔ خلیفہ ابوجعفر المنصور (754-75ء) نے تمام شیعہ رہنماؤں کو قتل کروا دیا۔ وہ انہیں اپنے اقتدار کے لئے ایک خطرہ تصور کرتا تھا۔ ان خلفاء نے اپنے لئے ایسے خطاب اختیار کئے جو ان کی بادشاہی کے الوہی حق کا اظہار کرتے تھے۔ خطاب المنصور کا مطلب تھا کہ اللہ نے اسے فتح حاصل کرنے کے لئے ''خصوصی مدد'' دی ہے اس کے بیٹے نے المہدی (775-85ء) کا خطاب اختیار کیا جس کا مطلب تھا ہدایت یافتہ شخص۔ اس اصطلاح کو شیعہ اپنے ایک امام کے لئے استعمال کرتے ہیں جو عدل اور امن کے عہد کو قائم کریں گے۔

شاید خلیفہ المہدی اس خطاب کو اپنا کر اپنے باپ کی طرف سے شیعوں کے قتل عام پر ان کی اشک شوئی کرنا چاہتا تھا۔ عباسیوں کو اس عدم اطمینان کا بھرپور علم تھا جس نے انہیں امویوں کو نیچا دکھانے میں مدد دی تھی اور انہیں اس حقیقت کا ادراک تھا کہ ان غیر مطمئن گروہوں کو لازماً رعایتیں دینی چاہئیں۔ اگرچہ وہ خود بھی عرب تھے تاہم سلطنت میں عربوں کو مراعاتی درجے پر فائز کرنے کے عمل کو ختم کر دیا۔ انہوں نے اپنا دارالخلافہ دمشق سے عراق

منتقل کر لیا' پہلے وہ کوفہ میں منتقل ہوئے اور بعدازاں انہوں نے بغداد کو اپنا دارالخلافہ بنا لیا۔ انہوں نے تمام صوبوں کے ساتھ مساوی برتاؤ کا عہد کیا اور کسی نسلی گروپ کے ساتھ خصوصی سلوک نہ کرنے کی روش کو اپنایا جس سے موالی مطمئن ہو گئے۔ ان کی سلطنت مساوات پسندانہ تھی اور ہر قابل شخص کے لئے دربار اور انتظامیہ تک رسائی کا راستہ کھلا تھا۔ تاہم کوفہ سے بغداد کی طرف منتقلی اہم تھی۔ بغداد کے مرکز میں انتظامیہ رہتی ہے۔ یہیں دربار تھا اور شاہی خاندان کے محل تھے۔ دست کاروں اور خادموں کے بازار اور گھر مرکز کے اردگرد واقع تھے۔ بغداد کو دریائے دجلہ کے کنارے آباد کیا گیا تھا' جو عراق کی زراعت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ساسانی عہد کے ایران کے دارالحکومت اصفہان کے بھی مماثل تھا نیز نئی خلافت کو قدیم قبل از اسلام بادشاہی کے نمونے پر استوار کیا گیا تھا۔

خلیفہ ہارون الرشید (809ء-789ء) کے زمانے تک تبدیلی کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ ہارون الرشید نے خلفائے راشدین کی بجائے قدیم طرز کے بادشاہوں کی طرح حکومت کی۔ وہ اپنی رعایا سے الگ تھلک رہتا تھا' اولین خلفا کے زیر اثر بے تکلفانہ رنگ میں رنگی ہوئی زندگی کی جگہ تکلفات نے لے لی۔ جب وہ دربار میں آتا تو حاضرین زمین کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ یہ انداز صرف اللہ کے سامنے جھکنے والے عربوں کے زمانے میں تو ناقابل تصور تھا۔ حالانکہ رسول کریم ﷺ نے دوسرے انسانوں کے مانند اپنے نام سے ہی ہمیشہ خود کو پکارا جانا پسند کیا تھا لیکن خلیفہ نے ''ظلِ الٰہ'' کا لقب اختیار کیا۔ دربار میں اس کی پشت پر جلاد کھڑے ہوتے تھے جو اس امر کی علامت تھے کہ خلیفہ اتنا طاقتور ہے کہ زندگی اور موت پر بھی اختیار رکھتا ہے۔ خلیفہ نے امت کے معاملات کو خود نمٹانے کی بجائے وزیروں پر چھوڑ دیا۔ اس کا کردار صرف دربار تک محدود ہو گیا تھا۔ تاہم وہ جمعہ کی نماز کی امامت کرواتا تھا اور جنگوں میں اپنی فوج کی کمان خود سنبھالتا تھا۔ تاہم خود فوج بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ اب یہ مسلمانوں کی فوج نہیں رہ گئی تھی بلکہ ایرانیوں کی فوج بن گئی تھی۔ ایرانیوں نے عباسیوں کو اقتدار دلوانے میں مدد دی تھی اور وہ خلیفہ کی ذاتی فوج تصور ہوتے تھے۔

یہ بات مذہبی تحریک کے لئے ناگوار تھی جس کے لوگوں نے عباسیوں کے پہلے پہل اقتدار میں آنے پر کافی امیدیں قائم کر لیں تھی۔ خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ رعایا کو تحفظ فراہم کرے اور ہارون الرشید کے دور میں' جب خلافت اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی' سلطنت میں بے نظیر امن قائم ہو چکا تھا۔ بغاوتوں کو سفاکی کے ساتھ کچل دیا گیا تھا اور عوام دیکھ سکتے کہ اس

حکومت کی مخالفت کرنا عبث ہے' تاہم لوگ زیادہ نارمل اور بغیر کسی پریشانی کے جی رہے تھے۔ ہارون الرشید علوم وفنون کا سرپرست تھا اور اس نے ایک عظیم ثقافتی نشاۃ ثانیہ برپا کی۔ ادبی تنقید' فلسفہ' شاعری' طب' ریاضی اور فلکیات نہ صرف بغداد میں بلکہ کوفہ' بصرہ اور حران میں بھی فروغ پا رہے تھے۔ ذمیوں نے یونان اور شام کی طبی اور فلسفیانہ کلاسیکی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کر کے اس نشاۃ ثانیہ میں حصہ لیا۔ ماضی کے علم کو بنیاد بنا کر' جو کہ اب انہیں دستیاب تھا' مسلمان عالموں نے اس زمانے میں پوری سابقہ تاریخ سے زیادہ سائنسی دریافتیں کیں۔ صنعت اور تجارت نے بھی فروغ پایا اور اشرافیہ عیش وعشرت کے ساتھ رہنے لگی۔ تاہم اس دور کو کسی بھی انداز سے اسلامی تصور کرنا مشکل تھا۔ خلیفہ اور اس کے قریبی لوگ عوام سے الگ تھلگ شان وشوکت کے ساتھ رہتے تھے جو کہ رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کی زاہدانہ روش کے یکسر متضاد تھا۔ قرآن کی چار بیویوں والی ہدایت کے برعکس انہوں نے ساسانی بادشاہوں کی طرح بڑے بڑے حرم بنا لئے تھے۔ مذہبی مصلحین کے پاس عباسیوں کو قبول کرنے کے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔

یہ حقیقت پسندی خصوصاً شیعوں میں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ کربلا میں حضرت حسینؓ کی المناک شہادت کے بعد ان کے جانشین مدینہ میں خلوت گزیں رہے اور زہدواتقا کی زندگی بسر کرتے رہے حالانکہ بہت سے لوگ انہیں امت کا امام برحق تصور کرتے تھے۔ حضرت حسینؓ کے سب سے بڑے بیٹے حضرت علی زین العابدین (وفات 714ء) جنہیں شیعہ حضرت علیؓ' حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے بعد چوتھا امام مانتے ہیں' ایک صوفی تھے اور انہوں نے دعاؤں کا ایک دلکش مجموعہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے[3]۔ پانچویں امام حضرت محمد الباقر (وفات 735ء) نے قرآن کو پڑھنے کا ایک باطنی طریقہ وضع کیا۔ ان کے مطابق ہر لفظ' ہر آیت ایک باطنی معنی کی حامل ہے' جسے صرف ارتکاز کی صوفیانہ تیکنیکوں کے ذریعے پایا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح دنیا کے تمام مذاہب میں بھی ہستی کے داخلی گوشوں تک مراقباتی رسائی کے لئے ایسی تیکنیکیں وضع کی گئی ہیں۔ حضرت باقرؒ نے ممکنہ طور پر ان باطنی معانی کی بنیاد پر اپنا امامت کا فلسفہ وضع کیا۔ ان کے بھائی حضرت زید ابن علیؒ ایک سیاسی کارکن (Activist) تھے اور بالآخر وہ 740ء میں امویوں کے خلاف ایک انقلاب میں شہید ہو گئے۔ تاہم 740ء میں حضرت باقرؒ کے پیروکار بہت کم تھے۔ زیادہ تر شیعہ حضرت باقر کی متصوفانہ گوشہ گیری پر حضرت زیدؒ کی انقلابی سیاست کو ترجیح دیتے تھے' لیکن شیعوں پر عباسیوں کے

سفا کانہ جبر کے بعد وہ لوگ چھٹے امام حضرت جعفر الصادق ؒ کی بات سننے پر آمادہ ہو گئے جنہیں خلیفہ المنصور نے قید کر رکھا تھا۔ حضرت جعفر صادق نے نص کے فلسفہ کو یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ اگرچہ وہ امام ہیں اور امت کے حقیقی رہنما ہیں تاہم وہ خلافت کے لئے اپنے دعویٰ پر اصرار نہیں کرتے۔ آئندہ سے امام ایک روحانی استاد ہو گا' وہ اپنی نسل کو الوہی علم اور قرآن کا باطنی فہم عطا کرے گا۔ شیعوں کو چاہئے کہ ایسی خطرناک سیاسی فضا میں اپنے نظریات اور سیاسی تصورات کو اپنے تک ہی رکھیں۔

تاہم اس فلسفے کو تصوف کی جانب مائل اشرافیہ ہی نے پسند کیا۔ زیادہ تر مسلمان ایک زیادہ سہل ایمان کے طلب گار تھے اور وہ انہیں اس نظریے میں مل گیا جو پہلے پہل اموی دور کے اختتام پر ظہور پذیر ہوا تھا مگر جسے ہارون الرشید کے عہد میں نمایاں مقام حاصل ہوا۔ یہ نظریہ عیسائیت کے حضرت عیسیٰ ؑ کے متعلق نظریے سے مشابہہ تھا۔ اس کے مطابق قرآن اللہ کا غیر مخلوق کلام ہے جو ابد سے موجود چلا آ رہا ہے اور جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کی شکل میں انسانوں کو ملا ہے۔ مسلمان خدا کو تو نہیں دیکھ سکتے تھے تاہم وہ قرآن کی تلاوت میں اسے سن سکتے تھے اور محسوس کر سکتے تھے کہ وہ الوہی حضوری میں ہیں۔ جب وہ وحی کے الفاظ بولتے تو خدا کا کلام ان کی زبان پر اور ان کے منہ میں ہوتا' جب وہ کتاب مقدس کو اٹھاتے تو وہ خدا کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے۔ اس فلسفے نے معتزلہ کو خوف زدہ کر دیا کیونکہ یہ ان کے عقل پسندانہ تقویٰ اور اتحاد کے کڑے احساس پر تنقید کرتا تھا اور خدا کی سادگی پر زور دیتا تھا۔ اس فلسفے نے قرآن کو دوسری الوہی ہستی بنا دیا تھا۔ تاہم باطنی شیعوں کی طرح معتزلہ بھی ایک دانش ورانہ اقلیت ہی رہے جبکہ قرآن سے یہ عقیدت بہت زیادہ مقبول ہو گئی۔ اس کے ماننے والوں کو اہل حدیث کہا جاتا تھا کیونکہ ان کا اصرار تھا کہ رسول کریم ﷺ کی سنت اور حدیث کو اسلامی قانون کی بنیاد ہونا چاہئے۔ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کے پیروکاروں سے اتفاق نہیں کیا جو کہتے تھے کہ فقیہہ کو اجتہاد کرنے کا اختیار حاصل ہے اور ان کا کہنا تھا کہ انہیں قرآنی ہدایت اور حدیث کو بنیاد بنائے بغیر قانون سازی کی اجازت ہونی چاہئے۔

چنانچہ اہل حدیث روایت پسند تھے' وہ مثالی ماضی کی محبت میں مبتلا تھے۔ وہ تمام خلفائے راشدین کا احترام کرتے تھے حتیٰ کہ حضرت معاویہؓ کا بھی رسول کریم ﷺ کے ایک ساتھی ہونے کی حیثیت میں احترام کرتے تھے۔ معتزلہ کے برعکس' جو کہ سیاسی طور پر فعال تھے' وہ اس امر پر اصرار کرتے تھے کہ ''خیر کا حکم دینے اور برائی سے روکنے'' کی ذمہ داری صرف

چند ہی لوگوں کی ہے۔ خلیفہ کا مذہب کوئی بھی ہو اس کی اطاعت کی جانی چاہئے۔ یہ چیز ہارون الرشید کو پسند آئی تھی جو زیادہ مذہبی تحریکوں سے مصالحت کے لئے مضطرب تھا۔ اس نے اہل حدیث کے انقلاب مخالف رجحان کو تسلیم کیا۔ بغداد میں معتزلہ کی قبولیت ختم ہو گئی اور اہل حدیث نے ان کا سماجی مقاطعہ کر دیا۔ ان کی درخواست پر چند مواقع پر تو حکومت نے ممتاز معتزلہ کو حوالۂ زنداں بھی کر دیا۔

عباسی مذہبی تحریک کی قوت سے آگاہ تھے اور چونکہ وہ اپنی حکمرانی کے سلسلے کو قائم کر چکے تھے اس لئے انہوں نے اپنے اقتدار کا اسلامی جواز مہیا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے رعایا کی زندگیوں کو باقاعدہ بنانے کے لئے فقہ کے ارتقا کی حوصلہ افزائی کی۔ سلطنت میں ایک تقسیم ابھرنے لگی۔ عام لوگوں کی زندگیوں پر شریعت کا اثر تھا مگر اسلامی اصول نہ تو دربار میں رائج تھے اور نہ ہی حکومت کے اعلیٰ عہدیداران پر عمل کرتے تھے بلکہ وہ عباسی ریاست کے مفادات کی غرض سے اسلام سے پہلے کے آمرانہ قاعدوں سے وابستہ تھے۔

امویوں کے زیر حکومت ہر شہر نے اپنی الگ فقہ وضع کر لی ہوئی تھی تاہم عباسیوں نے فقہا پر زور دیا کہ وہ قانون کا زیادہ متفقہ نظام وضع کریں۔ مسلمانوں کی زندگی کی ساخت میں زبردست تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ چونکہ اسلام قبول کرنے کے عمل کی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی اس لئے ذمی ایک اقلیت بنتے جا رہے تھے۔ اب مسلمان اشرافیہ کا ایک چھوٹا سا گروپ نہیں رہے تھے جو غیر مسلم اکثریت سے الگ تھلگ عسکری شہروں میں رہتے تھے بلکہ اب وہ اکثریت میں تھے۔ کچھ مسلمانوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا اور اب بھی اپنے قدیم عقائد اور اعمال پر عمل پیرا تھے۔ عوام کی زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لئے ایک نظام اور مسلمہ اداروں کی ضرورت تھی۔ اس وقت علما کا ایک ممتاز طبقہ ابھرنا شروع ہوا۔ قاضیوں کو زیادہ بھرپور تربیت دی جانے لگی اور المہدی اور ہارون الرشید نے فقہ کے سرپرست بن کر قانون کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کی۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل دو علما نے لافانی کام سرانجام دیا۔ مدینہ میں امام مالک ابن انسؒ (وفات 795ء) نے ایک جامع کتاب ترتیب دی، جس میں مدینہ میں رائج قوانین اور مذہبی افعال کو پیش کیا گیا تھا، جن کے بارے میں مالک ابن انسؒ کا ایمان تھا کہ رسول کریم ﷺ کی سنت ان میں محفوظ ہے۔ آپ کے شاگردوں نے آپ کے نظریات کو مالکی مکتب فکر کی صورت میں ترقی دی جو مدینہ، مصر اور شمالی افریقہ میں پھیل گیا۔

تاہم دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ موجودہ دور کا مدینہ حقیقتاً بدعتوں سے خالی اسلام کا ایک قابلِ اعتماد رہنما ہے۔ امام محمد ادریس ابن الشافعیؒ (وفات 820ء) نے' جو کہ غزہ میں غربت میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے امام مالکؒ کے ساتھ مدینہ میں تعلیم حاصل کی تھی' کہا کہ کسی ایک اسلامی شہر پر انحصار کرنا درست نہیں ہے' چاہے اس کا ماضی کتنا ہی جلیل القدر ہو۔ اس کے بجائے تمام فقہ کی بنیاد رسول کریم ﷺ کی احادیث کو ہونا چاہئے کیونکہ آپ ﷺ قرآن کے حقیقی شارح بھی تھے۔ قرآن کے احکامات اور قوانین کو حضرت محمد ﷺ کی حدیث اور سنت کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ تاہم شافعی مسلک کے لوگ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہر حدیث کے راوی ایسے مستند اور متقی مسلمان ہونے چاہئیں' جن کا سلسلہ خود حضرت محمد ﷺ تک براہِ راست قائم ہو۔ اس کو اسناد کہا جاتا ہے۔ اسناد کی لازماً سخت چھان پھٹک کی جانی چاہئے اور اگر اس زنجیر کی ایک کڑی بھی بُرا راوی ثابت ہو تو ایسی حدیث کو بالکل قبول نہیں کرنا چاہئے۔ امام شافعیؒ نے اہل حدیث اور امام ابو حنیفہؒ جیسے ان فقہا کے مابین مصالحت کی کوشش کی جو اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ امام شافعیؒ اس بات سے متفق تھے کہ اجتہاد کسی حد تک ضروری بھی ہے تاہم ان کا ایمان تھا کہ اس کو رسول کریم ﷺ کی روایات اور معاصر عمل کے درمیان قیاس تک محدود ہونا چاہیے۔ امام شافعیؒ نے کہا کہ اصول فقہ چار ہیں یعنی قرآن' سنت رسول ﷺ' قیاس اور اجماع۔ خدا پوری امت کو باطل پر نہیں ہونے دے گا اس لئے اگر کسی روایت کو تمام مسلمان قبول کر لیں خواہ اس کی تائید کوئی ایک قرآنی آیت یا حدیث نہ بھی کرتی ہو تو اسے مصدقہ و مسلمہ تسلیم کیا جانا چاہئے۔ امام شافعیؒ کا طریق درستی کے جدید معیارات کے مطابق رسول کریم ﷺ کی سنت کی ٹھوس تاریخیت کو یقینی بنانے کا اہل نہیں تھا تاہم یہ ایک ایسے طرز زندگی کی تخلیق کے لئے خاکہ ضرور مہیا کر سکتا تھا جو مسلمانوں کو ایک گہرا اور اطمینان بخش مذہبی تجربہ یقیناً کرواتا۔

امام شافعیؒ کے کام کی بنیاد پر دوسرے عالموں نے احادیث کا مطالعہ کیا۔ امام بخاریؒ (وفات 870ء) اور امام مسلمؒ (وفات 878ء) نے حدیث کے دو مستند مجموعے مرتب کئے جنہوں نے فقہ میں دلچسپی کو فروغ دیا اور بالآخر پوری اسلامی سلطنت میں شریعت کے مقدس قانون کی بنیاد پر استوار ایک یکساں مذہبی زندگی کو تخلیق کیا۔ اس قانون کا سرچشمہ انسان کامل یعنی حضرت محمد ﷺ کی شخصیت تھی۔ مسلمانوں نے اس امید کے ساتھ آپ ﷺ کی خارجی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی عمل کرتے ہوئے اور آپ ﷺ کے کھانے'

دھونے، بولنے اور عبادت کرنے کے انداز کو اپناتے ہوئے زندگی بسر کرنا شروع کی کہ اس طرح وہ آپ ﷺ کی مانند اللہ کی کامل اطاعت کرنے کے اہل ہو جائیں گے۔ مذہبی تصورات اور افعال اس لئے جڑ نہیں پکڑ گئے تھے کہ انہیں طاقتور الٰہیات دانوں نے فروغ دیا تھا اور نہ ہی اس لئے کہ ان کی تاریخی یا عقلی بنیاد دکھائی جا سکتی تھی بلکہ اس لئے کہ ان پر عمل کرنے سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ مومنوں کو مقدس ماورائیت کا احساس مہیا کرتے ہیں۔ اس وقت سے مسلمان سنت کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں، جس نے انہیں حضرت محمد ﷺ کی شخصیت کے ساتھ ایک نہایت گہری سطح پر داخلی قربت عطا کی اور آپ ﷺ کو ساتویں صدی عیسوی میں ہی نہیں بلکہ ان کی زندگیوں میں دائمی طور پر ایک زندہ موجودگی اور انہی کا جزو بنا دیا۔

تاہم شریعت بھی تمام اسلامی نیکوکاری کی طرح سیاسی ہی تھی۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے خلاف احتجاج کرتی تھی جسے مذہبی لوگ بدعنوان تصور کرتے تھے۔ امام مالک ابن انسؒ اور امام شافعیؒ دونوں نے اولین عباسیوں کے خلاف شیعہ انقلابوں میں حصہ لیا تھا۔ دونوں ہی کو سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے قید کیا گیا۔ تاہم انہیں رہا کر دیا گیا اور المہدی اور ہارون الرشید نے ان کی سرپرستی کی جو ان کی لیاقت کو استعمال کر کے پوری سلطنت کے لئے ایک مشترکہ قانونی نظام تشکیل دینا چاہتے تھے۔ شریعت نے درباری شان و شوکت اور بادشاہت کو مکمل طور پر رد کر دیا۔ اس نے خلیفہ کے اقتدار کو محدود کیا، اس امر پر زور دیا کہ وہ رسول کریم ﷺ یا خلفائے راشدین جیسا کردار نہیں رکھتا بلکہ اس کو تو صرف مقدس قانون کے منتظم بننے کی اجازت ہے۔ لہٰذا درباری داری کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے مکمل طور پر مطعون کیا گیا۔ قرآن کی طرح شریعت بھی مساوات کا حکم دیتی ہے۔ اس میں کمزوروں کے تحفظ کے لئے خصوصی احکامات موجود ہیں نیز خلافت یا دربار جیسا کوئی ادارہ فرد کے ذاتی فیصلوں اور عقائد میں مداخلت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ ہر مسلمان پر یہ منفرد فرض عائد ہے کہ وہ اللہ کے احکامات پر عمل کرے اور کوئی مذہبی مقتدرہ (اتھارٹی)، کوئی ادارہ (جیسے ''چرچ'') اور مذہبی پیشواؤں کا کوئی مخصوص گروہ مسلمان فرد اور اللہ کے درمیان نہیں آ سکتا۔ سب مسلمان برابر تھے۔ کوئی اشرافیہ ملائیت یا پیشوائیت وسیلے کا کردار ادا نہیں کر سکتی۔ یوں شریعت معاشرے کو دربار سے بالکل مختلف سانچے میں ڈھالنے کے لئے کوشاں تھی۔ اس کا مقصد ایک دوسری ثقافت تشکیل دینا اور ایک احتجاجی تحریک منظم کرنا تھا جس کی وجہ سے اس کا خلافت کے ساتھ تنازعہ پیدا ہو گیا۔

ہارون الرشید کے دور اقتدار کے اختتام تک یہ واضح ہو گیا تھا کہ خلافت اپنے عروج کے مرحلے کو عبور کر چکی ہے۔ جدید ذرائع مواصلات اور رابطوں کے جدید وسائل کے وجود میں آنے سے پہلے کوئی واحد حکومت اس قدر وسیع علاقے پر لامحدود وقت تک کنٹرول نہیں رکھ سکتی تھی۔ مرکز سے دور واقع صوبے مثلاً سپین (جہاں ایک مفرور اموی نے 756ء میں ایک مخالف سلسلۂ حکومت قائم کیا تھا) الگ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ معیشت کو زوال آ رہا تھا۔ ہارون الرشید نے سلطنت کو اپنے دو بیٹوں میں بانٹ کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی وفات کے بعد دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی چھڑ گئی (13-809ء)۔ اس زمانے میں دربار کی سیکولر ساخت کی یہ علامت تھی کہ فتنہ جنگوں کے برخلاف اس خانہ جنگی کا کوئی نظریاتی یا مذہبی محرک نہیں تھا' یہ تو سیدھا سادا شخصی عزائم کا تصادم تھا۔ جب مامون الرشید فاتح ٹھہرا اور اس نے اپنے دور اقتدار (33-813ء) کا آغاز کیا تو یہ امر واضح تھا کہ سلطنت میں دو بڑے مراکز قوت تھے: ایک تھا دربار کا اشرافی حلقہ اور دوسرا شریعت کی بنیاد پر قائم مساوات پسند اور ''دستور پسند'' حلقہ۔

مامون الرشید کو اپنے اقتدار کی کمزوری کا علم تھا۔ اس کا دور اقتدار خانہ جنگی' کوفہ اور بصرہ میں شیعی بغاوت (15-814ء) اور خراسان میں ایک خارجی انقلاب سے شروع ہوا تھا۔ اس نے ان مخالف گروپوں سے مصالحت اور مذہبی تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی تاہم اس کی ان پالیسیوں کی وجہ سے معاملات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ خود ایک دانشور ہونے کی وجہ سے اسے طبعاً معتزلہ کی عقلیت پسندی نے اپنی طرف راغب کر لیا اور وہ ان کی حمایت کرنے لگا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ اہل حدیث جو اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہر مسلمان کی الوہی قانون تک براہِ راست رسائی ہوتی ہے' ان کی عوامی تحریک مطلق بادشاہت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ چونکہ معتزلہ دوبارہ اقتدار میں آ گئے تھے لہٰذا انہوں نے اہل حدیث سے اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا بدلہ لینا شروع کر دیا۔ امام احمد بن حنبلؒ (وفات 855ء) جیسے ممتاز اہل حدیث کو قید میں ڈال دیا گیا۔ امام احمد بن حنبلؒ ایک عوامی ہیرو بن گئے۔ معتزلہ کی حمایت کر کے مامون نے کوئی بھلا کام نہیں کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عوام سے کٹ کر رہ گیا۔ ایک مرحلے پر خلیفہ نے شیعوں کے آٹھویں امام علی الرضا کو اپنا جانشین بنا کر ان کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تاہم شیعہ بھی معتزلہ کی طرح فقط ایک روحانی اور دانشور اشرافیہ ہی تھے اور وہ خلیفہ کے لئے عوامی تائید حاصل نہیں کروا سکتے تھے۔ چند ماہ بعد امام رضا

فوت ہو گئے' امکان ہے کہ انہیں قتل کیا گیا ہو۔

بعد میں آنے والے خلفا نے شیعوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی اور کبھی ایک اور کبھی دوسرے مذہبی دھڑے کے درمیان معلق رہے' جبکہ انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ خلیفہ المعتصم نے فوج کو اپنی ذاتی فوج میں بدل کر بادشاہت کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ اس کی فوج ترک غلاموں پر مشتمل تھی۔ تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عوام سے مزید الگ تھلگ ہو گیا نیز ترک فوجیوں اور بغداد کے لوگوں کے مابین تناؤ پیدا ہو گیا۔ اسی وجہ سے خلیفہ نے دارالخلافہ سامرہ منتقل کرلیا جو کہ بغداد کے جنوب میں ساٹھ میل دور واقع تھا۔ لیکن اس کے اس اقدام نے اسے مزید الگ تھلگ کر دیا۔ ترک' جن کا لوگوں کے ساتھ کوئی فطری رابطہ نہیں تھا ہر عشرے میں مضبوط ہوتے گئے اور آخرکار وہ خلیفہ سے الگ سلطنت کا کنٹرول حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نویں صدی کے اواخر اور دسویں صدی کے شروع میں سیاسی طور پر سرگرم شیعوں نے مسلح بغاوتیں کیں اور انہوں نے متصوفانہ گوشہ گیری نہیں اپنائی۔ ادھر معاشی بحران بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔

تاہم سیاسی انتشار کے دنوں میں سنی مسلک نے تقویت پائی۔ معتزلہ اور اہل حدیث نے رفتہ رفتہ اپنے اختلافات ختم کر دئے اور باہم قریب ہو گئے۔ اس عمل میں ایک اہم شخصیت تھے ابوالحسن الاشعری (وفات 935ء) جنہوں نے معتزلہ اور اہل حدیث کی الٰہیات کے مابین توافق کی کوشش کی۔ معتزلہ خدا کے تجسیمی تصورات سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ انہوں نے اس امر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ خدا کوئی ''انسانی'' اوصاف رکھتا ہے۔ جب قرآن اس امر پر زور دیتا ہے تو خدا کس طرح ''بول'' یا ''کسی تخت پر بیٹھ'' سکتا ہے؟ ہم خدا کے ''علم'' یا ''طاقت'' کے بارے میں کیسے بات کر سکتے ہیں؟ جبکہ اہل حدیث کا کہنا تھا کہ اس سے خدا کا درجہ گھٹ کر کسی مذہبی خصوصیت سے عاری تجرید ہی رہ جاتا ہے۔ الاشعریؒ نے ان سے موافقت تو کی' تاہم معتزلہ کی بات یہ کہہ کر تسلیم کی کہ خدا کی صفات انسانی اوصاف کے جیسی نہیں ہیں۔ قرآن خدا کا غیرمخلوق کلام ہے تاہم انسانی الفاظ جو اس کا اظہار کرتے ہیں اور روشنائی اور کتاب کا کاغذ مخلوق ہیں۔ حقیقت کے پردے میں نہاں کسی پراسرار جوہر کی تلاش لایعنی ہے۔ وہ تاریخ کے ٹھوس حقائق ہی کو جان سکتے ہیں۔ الاشعریؒ کے خیال میں کوئی فطری قوانین موجود نہیں ہیں۔ خدا ہر لمحہ دنیا کو اپنے امر سے چلا رہا ہے۔

آزاد ارادے جیسی کوئی شے وجود نہیں رکھتی ہے' لوگ اس وقت تک کچھ نہیں سوچ سکتے جب تک خدا ان میں اور ان کے ذریعے نہ سوچے۔ آگ اس لئے نہیں جلتی ہے کہ جلنا اس کی فطرت ہے بلکہ وہ تو اللہ کی مرضی سے جلتی ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت ہمیشہ معتزلہ کے افکار کو اپنے لئے ناقابل فہم پاتی تھی۔ اس کے برعکس الاشعریؒ کا فلسفہ سنی مسلمانوں کا غالب فلسفہ بن گیا۔ واضح بات ہے کہ یہ کوئی عقلیت پسندانہ مسلک نہیں تھا بلکہ زیادہ متصوفانہ اور مراقباتی نظام تھا۔ اس نے مسلمانوں کو باور کرایا کہ قرآن کے مطابق الوہی ہستی ہر جگہ موجود ہے' خارجی حقیقت میں ماورائی حقیقت کو نہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اہل حدیث کے ہاں موجود اس تشنگی کو سیراب کیا کہ خدا کا تجربہ ٹھوس حقیقت میں کیا جائے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ تھا جو کہ شریعت کی روح سے ہم آہنگ تھا۔ مسلمان حضرت محمد ﷺ کے طرزِ حیات کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے تھے۔ اللہ کے محبوب رسول حضرت محمد ﷺ کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے یتیموں سے شفقت کا سلوک کر کے' غریبوں کی دادرسی کر کے اور جانوروں پر مہربانی کر کے یا کھانا کھاتے ہوئے تہذیب و شائستگی کا رویہ اپنا کر خود کو خدا کا پسندیدہ انسان بنایا جا سکتا تھا۔ مسلمان قرآن کی ہدایت پر عمل کر کے خدا کا ذکر کرتے ہوئے اپنی زندگیوں کے شگافوں کو بھر لیتے تھے[4] دسویں صدی کے وسط تک شریعت پوری سلطنت میں رواج پا گئی۔ فقہ کے چار مکتب فکر تھے یعنی حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی۔ مؤخرالذکر مکتب فکر امام حنبلؒ کے افکار پر مبنی تھا اور اہل حدیث اسے مانتے تھے۔ عملی طور پر ان چاروں مسلکوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ ہر مسلمان ان میں سے کسی کو بھی چن سکتا تھا تاہم زیادہ تر مسلمان مقامی طور پر غالب مسلک ہی کی طرف مائل ہوتے تھے۔

تاہم جیسا کہ کوئی فرد توقع کر سکتا ہے سنی مسلمانوں کو متحد کرنے والا عامل سیاسی تھا۔ خدا کا تجربہ برادری کی اختیار کردہ صورت میں کیا گیا اور اس نے ایک مسلمان کی ذاتی پرہیزگاری پر اثر ڈالا۔ تمام سنی مسلمان حضرت محمد ﷺ اور خلفائے راشدین کا احترام کرتے

تھے۔ حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ اپنی ناکامیوں کے باوجود نہایت متقی مسلمان تھے اور وہ اللہ کی اطاعت کے معاملے میں موجودہ حکمرانوں سے کہیں آگے تھے۔ سنیوں نے شیعوں کے برعکس پہلے تین خلفائے راشدین کا مقام گھٹایا نہیں۔ شیعہ کہتے تھے کہ صرف حضرت علیؓ ہی امت کے امام ہیں۔ شیعوں کے المیہ وژن کے مقابلے میں سنیوں کا مسلک زیادہ امید پرستانہ تھا۔ ان کا ایمان تھا کہ خدا ناکامیوں اور تنازعوں کے وقت بھی ان کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ برادری کی وحدت ایک مقدس قدر تھی کیونکہ اس سے اللہ کی توحید کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ کسی بھی فرقہ وارانہ تقسیم سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ چنانچہ امن کے حصول کے لئے موجودہ خلیفوں کو ضرور تسلیم کرنا چاہئے، حالانکہ ان کی خامیاں واضح ہیں۔ اگر مسلمان شریعت کے مطابق زندگی بسر کریں تو وہ ایک جوابی ثقافت تخلیق کر کے موجودہ بدعنوان سیاسی نظام کو تبدیل کر سکتے ہیں اور اسے اللہ کی رضا کے تابع بنا سکتے ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁

باطنی تحریکیں

اگر چہ اکثریت اس عقیدے پر عمل پیرا تھی تاہم اس نے سب مسلمانوں کو مطمئن نہیں کیا۔ جو لوگ زیادہ دانشور تھے یا تصوف کی طرف مائل تھے انہیں مذہب کی مختلف تعبیر کی ضرورت تھی۔ عباسیوں کے عہد میں اسلامی فلسفے اور روحانیت کی چار مزید پیچیدہ شکلیں ظہور میں آئیں جنہوں نے اشرافیہ ہی کو متاثر کیا۔ ان تصورات کو عام لوگوں سے خفیہ رکھا گیا تھا کیونکہ ماہرین کا ایمان تھا کہ کم تر ذہانت رکھنے والے لوگ انہیں غلط سمجھ لیں گے اور یہ کہ وہ صرف عبادت اور مراقبے سے شعور پا سکتے ہیں۔ یہ راز داری خود حفاظتی کا بھی ایک طریقہ تھی۔ شیعوں کے چھٹے امام جعفر الصادق نے اپنے شاگردوں کو اپنی حفاظت کی غرض سے تقیہ پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی۔ شیعوں کے لئے وہ زمانہ بہت کڑا تھا کیونکہ انہیں سیاسی انتظامیہ کی جانب سے خطرہ لاحق تھا۔ ادھر علما کو بھی ان باطنی گروہوں کی مذہبی راستی کے حوالے سے شبہات تھے۔ تقیہ نے تنازعے کو بہت ہی کم کر دیا۔ عیسائیت میں ایسا ہوتا تھا کہ جو لوگ انتظامیہ (اسٹیبلشمنٹ) سے مختلف عقائد کے حامل ہوتے انہیں بدعتی قرار دے کر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اسلام کے یہ پوشیدہ اختلاف کرنے والے لوگ اپنے نظریات کے حوالے سے خاموش رہے اور انہوں نے عام طور پر اپنے بستر پر ہی موت کو گلے لگایا۔ تاہم خفیہ رکھنے کی پالیسی ایک گہری معنویت بھی رکھتی تھی۔ باطنیوں کی فکر اور الٰہیاتی بصیرت مجموعی طرز زندگی کا ایک حصہ تھیں۔ متصوفانہ افکار کو خاص طور پر تخیلاتی اور وجدانی اعتبار سے درست سمجھ کر ان کا تجربہ کیا جا سکتا تھا مگر ضروری نہیں تھا کہ انہیں کوئی باہر والا عام فرد عقلی طور پر سمجھ سکے۔ اگر کوئی شخص اس کا مکمل طور پر جائزہ لینا چاہتا تو اسے ایک خاص جمالیاتی تربیت اور مہارت درکار ہوتی تھی۔

باطنیوں کا خیال تھا کہ ان کے تصورات بدعت نہیں ہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ وہ عام

علماء کے مقابلے میں وحی کے زیادہ گہرے معانی کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بات بھی ضرور ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسلام میں عقائد اور افکار اتنے اہم نہیں ہیں جتنے عیسائیت میں اہم ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو کچھ مخصوص تصورات کو تسلیم کرنے کی بجائے لوگوں سے ایک خاص انداز سے زندگی بسر کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ سب مسلمان جو باطنی مسلکوں کی طرف مائل ہوئے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان پر عمل کرتے تھے۔ وہ ''شہادت'' دیتے تھے کہ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' وہ روزانہ پانچ وقت نماز پڑھا کرتے تھے' زکوٰۃ ادا کیا کرتے تھے' رمضان کے مہینے میں روزے رکھا کرتے تھے اور اگر حالات اجازت دیتے تو زندگی میں ایک مرتبہ مکہ جا کر حج کیا کرتے تھے۔ جو شخص بھی ان بنیادی ارکان پر عمل پیرا ہوتا وہ سچا مسلمان ہوتا تھا چاہے اس مرد یا عورت کے عقائد کچھ بھی ہوں۔

ہم شیعیت کے نظریے تقیہ پر پہلے گفتگو کر آئے ہیں جسے امام جعفر الصادق نے عباسیوں کے اقتدار میں آنے کے فوری بعد وضع کیا تھا۔ اگرچہ شیعہ بھی سنیوں کی طرح شریعت کو مانتے تھے تاہم ان کی اپنی فقہ تھی (جس کا نام امام جعفر الصادق کے نام پر ''فقہ جعفریہ'' ہے) اور وہ اپنے وقت کے امام سے ہدایت و رہنمائی لیا کرتے تھے جسے اپنے دور کے لوگوں کے لئے الوہی ''علم'' عطا کیا گیا ہوتا تھا۔ امام کسی بھی خطا سے پاک روحانی ہادی اور ایک کامل قاضی ہوتا تھا۔ سنیوں کی طرح شیعہ بھی مسلمانوں کی اولین برادری کی طرح اللہ کا براہِ راست تجربہ کرنا چاہتے تھے' جس نے حضرت محمد ﷺ پر اللہ کی وحی قرآن کو نازل ہوتے دیکھا تھا۔ الوہی ہدایت یافتہ امام کی علامت سے شیعوں کے مقدس حضوری کے شعور کی عکاسی ہوتی تھی' جس کو صرف سچے ارتکاز کرنے والے افراد ہی پا سکتے تھے مگر خطرناک دنیا سے پوشیدہ رکھتے تھے۔ امامت کا نظریہ عام سیاسی زندگی کی المناک صورتحال میں الوہی ہدایت کو عملی جامہ پہنانے میں درپیش شدید ترین مشکلات کو ظاہر کرتا ہے۔ شیعہ یقین رکھتے تھے کہ ہر امام کو اس کے عہد کے خلیفہ نے قتل کروا دیا تھا۔ کربلا میں تیسرے امام حضرت حسینؓ کی شہادت اس بات کی بین مثال تھی کہ اس دنیا میں خدا کی رضا پر عمل کرنا کتنا مشکل ہے۔ دسویں صدی سے شیعہ عاشورہ کے دن (10 محرم) کو آپؓ کی شہادت کا سوگ عوامی سطح پر منانے لگے۔ وہ آنسو بہاتے' سینے پیٹتے ہوئے گلیوں میں سے گزرتے اور مسلم سیاسی زندگی کی بدعنوانی کے خلاف اپنی لافانی مخالفت کا اعلان کرتے جاتے۔ ان کا احتجاج قرآن کے واضح احکامات کی خلاف ورزی کر کے امیروں کو مراعات دینے اور غریبوں کو کچل دینے کے عمل کے خلاف ہوتا تھا۔ ہو سکتا

ہے کہ امام جعفر الصادق کی پیروی کرنے والے شیعہ سیاست سے الگ رہتے تاہم سماجی انصاف کی لگن ان کے اس احتجاج میں دل بن کر دھڑکتی تھی۔

جب نویں صدی کے دوران خلافت کو زوال آنے لگا تو عباسیوں کی شیعوں کے خلاف عداوت دوبارہ ابھر آئی۔ خلیفہ المتوکل (61-847ء) نے دسویں امام علی الہادی کو مدینہ سے سامرا بلایا اور انہیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے رسول کریم ﷺ کی حقیقی اولاد کے آزاد رہنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔ اس کے بعد سے امام حقیقتاً شیعوں کے لئے نا قابل رسائی ہو گئے اور وہ صرف ''نائبوں'' کے ذریعے ہی اپنے ماننے والوں سے رابطہ رکھ سکتے تھے۔ جب 874ء میں گیارہویں امام فوت ہوئے تو بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا ایک بیٹا تھا جو اپنی زندگی بچانے کے لئے غیبت میں چلا گیا۔ یقینی طور پر بارہویں امام کا کوئی واضح سراغ نہیں ہے جو کہ ہو سکتا ہے پہلے ہی فوت ہو گئے ہوں۔ تاہم آج بھی نائب ان کی طرف سے شیعوں کی سربراہی کرتے ہوئے انہیں قرآن کے باطنی مطالعے میں رہنمائی دیتے ہیں، زکوٰۃ جمع کرتے ہیں اور قانونی فیصلے کرتے ہیں۔ جب 934ء میں امام غائب اپنی فطری زندگی پوری کر چکے تو ان کا نائب شیعوں کے لئے ایک خصوصی پیغام لے کر آیا۔ اس پیغام کے مطابق وہ پردۂ غیب میں چلے گئے تھے اور خدا نے انہیں معجزانہ طور پر چھپا لیا تھا اور وہ شیعوں سے مزید رابطہ نہیں رکھیں گے۔ وہ ایک لمبے عرصے کے بعد کسی روز انصاف کے دور کا آغاز کرنے کے لئے واپس آئیں گے۔ امام غائب کے پردۂ غیب میں چلے جانے کے قصے کو کسی دنیاوی واقعے کے بیان کی طرح حقیقی معنوں میں نہیں لینا چاہئے۔ یہ تو ایک صوفیانہ نظریہ تھا جو ایک ناقابل گرفت، غیر مرئی یا ناقابل رسائی، دنیا میں حاضر مگر غیر دنیاوی ہستی کے بارے میں ہمارے احساس کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دنیا میں سچی مذہبی پالیسی کا نفاذ ناممکن ہے کیونکہ موجودہ خلفا نے اس زمین سے حضرت علیؓ کے علم کو مٹا ڈالا تھا۔ اس کے بعد سے شیعہ علما امام غائب کے نمائندہ بن گئے اور ان کی رضا کی تشریح و تعبیر کے لئے اپنی صوفیانہ اور عقلی بصیرتوں کو استعمال کرنے لگے۔ بارہ اماموں پر ایمان رکھنے والے شیعوں نے سیاسی زندگی میں مزید کوئی حصہ نہیں لیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ امت کے سچے رہنما امام غائب کی عدم موجودگی میں کوئی بھی حکومت جائز نہیں ہو سکتی۔ امام کی واپسی کے لئے ان کی آرزو مندی برادری کی حالت پر ایک الوہی بے اطمینانی کا اظہار کرتی تھی۔

تمام شیعہ نہ تو بارہ اماموں کو ماننے والے تھے نہ سیاست سے نفرت کرتے تھے۔

اسماعیلیوں کو یقین تھا کہ حضرت علیؓ کا سلسلہ امام جعفر الصادق کے بیٹے حضرت اسماعیل پر ختم ہو جاتا ہے، جنہیں امام متعین کیا گیا تھا مگر وہ اپنے والد سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔ وہ امام جعفر الصادق کے دوسرے بیٹے حضرت موسیٰ کاظم کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے جبکہ بارہ اماموں کو ماننے والے شیعہ انہیں ساتواں امام تسلیم کرتے ہیں۔ 5 انہوں نے ایک مخفی روحانیت بھی تشکیل دی تھی جو صحیفے کے باطنی مفہوم کو بیان کرتی تھی۔ تاہم سیاسی زندگی سے الگ ہونے کی بجائے انہوں نے ایک سراسر مختلف سیاسی نظام وضع کرنے کی کوشش کی اور ان میں سے بیشتر سیاسی طور پر فعال تھے۔ 909ء میں ایک اسماعیلی رہنما تیونس پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے المھدی کا لقب اختیار کر لیا۔ 983ء میں اسماعیلیوں نے عباسیوں سے مصر بھی چھین لیا اور قاہرہ میں متوازی خلافت قائم کر لی جو لگ بھگ دوصدیوں تک برقرار رہی۔ اس کے علاوہ شام، عراق، ایران اور یمن میں بھی اسماعیلی خفیہ طور پر سرگرم رہے۔ لوگوں کو مقامی ''داعی'' بتدریج فرقے میں شامل کیا کرتا تھا۔ جس مذہب پر نچلے درجوں میں عمل کیا جاتا تھا وہ اہل سنت جیسا نہیں تھا تاہم نیا شامل ہونے والا شخص جوں جوں ترقی پاتا جاتا اسے ایک زیادہ پیچیدہ فلسفے اور روحانیت سے متعارف کروایا جاتا تھا جس میں ماورائی حیرت کے احساس کو بیدار کرنے کے لئے ریاضی اور سائنس کو بطور وسیلہ استعمال کیا جاتا تھا۔ قرآن پر گہرا غور وفکر کرنے کے بعد اسماعیلیوں نے تاریخ کے دائروی تصور کو وضع کیا جس کے مطابق ان کا ایمان تھا کہ جب سے شیطان نے خدا سے بغاوت کی ہے دنیا کو زوال آرہا ہے۔ دنیا میں چھ عظیم پیغمبر (حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ) ہیں، جن میں سے ہر ایک نے اس زوال کو روکا تھا۔ ہر پیغمبر کا ایک ''وصی'' تھا جس نے اپنے پیغام کے خفیہ معانی ان لوگوں کو سکھائے جو اسے سمجھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ کے وصی حضرت ہارونؑ اور حضرت محمد ﷺ کے وصی حضرت علیؓ تھے۔ مومن ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر دنیا کو عدل کے آخری دور کے لئے تیار کریں گے جس کا آغاز حضرت مہدیؑ کریں گے۔

یہ ایک پرکشش تحریک تھی۔ جہاں سنی دربار کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے علوم و فنون سے دور ہو گئے تھے وہاں اسماعیلیوں نے زیادہ دانشور مسلمانوں کو مذہبی طریقے سے نئے فلسفے کا مطالعہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ وہ قرآن کی اپنی روحانی تفسیر میں ''تاویل'' کو استعمال کرتے تھے جو کہ عبادت گزار کی توجہ لفظی معانی سے ہٹا کر پوشیدہ، الوہی حقیقت کی طرف لے

جاتی تھی جو کہ اس کا اصل سرچشمہ تھی۔ قرآن زور دیتا ہے کہ الوہی ہستی کو مکمل طور پر عقلی یا منطقی انداز سے بیان نہیں کیا جا سکتا اس لئے خدا اپنے بندوں سے نشانیوں (آیات) کے ذریعے ابلاغ کرتا ہے۔ اسماعیلی ہمیشہ خدا کے لئے کنایۃً ''ناقابل تصور'' کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ خدا ہمیشہ انسانی سوچ سے بلند تر رہا ہے اس لئے کوئی انکشاف یا الٰہیاتی نظام کبھی حتمی نہیں ہو پایا۔ اسماعیلی اس بات سے اتفاق کرتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ آخری اور چھ بڑے پیغمبروں میں سب سے زیادہ اہم پیغمبر ہیں تاہم وہ یہ بھی کہتے تھے کہ آپ ﷺ جس وحی کو لے کر آئے تھے اس کی وضاحت صرف حضرت مہدیؑ آ کر کریں گے۔ چنانچہ وہ نئے سچ کے امکان کے لئے کشادہ تھے جو کہ زیادہ روایت پسند علما کے لئے چونکا دینے والا امر تھا۔ تاہم اسماعیلیت محض ایک استغراقی مسلک نہیں تھا۔ تمام سچے مسلمانوں کی طرح وہ بھی امت کی تقدیر کے بارے میں متفکر تھے اور ان کا ایمان تھا کہ اگر عقیدے کو سیاسی عمل سے جدا رکھا جائے تو وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ ایک عادلانہ اور شائستہ معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کر کے درحقیقت وہ حضرت مہدیؑ کی آمد کا راستہ ہموار کر رہے ہوتے ہیں۔ اسماعیلیوں کے خلافت قائم کرنے سے ظاہر ہوا کہ ان کے مثالئے (آئیڈیل) میں سیاسی جوہر نہاں تھا تاہم یہ کبھی اکثریت کو متاثر نہیں کر سکا۔ اسماعیلی وژن بہت زیادہ نظام مراتب والا اور اشرافی تھا جس کی وجہ سے اس میں دانشور مسلمانوں کی بہت تھوڑی سی تعداد کے لئے ہی کشش تھی۔

اسماعیلیوں نے اس زمانے میں ابھرنے والی تیسری مخفی تحریک ''فلسفہ'' سے کافی مقدار میں کائناتی علامتیں اخذ کیں۔ اس تحریک نے عباسیوں کے دور میں برپا ہونے والی ثقافتی نشاۃ ثانیہ سے جنم لیا تھا' خاص طور پر یونانی فلسفہ' سائنس اور طب سے جو کہ مسلمانوں کو اس وقت عربی میں دستیاب تھے۔ فیلسوف ہیلنی (Hellenistic) مسلکِ عقلیت کے گرویدہ تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ عقلیت پسندی (Rationalism) مذہب کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ وہ اس کی زیادہ اعلیٰ بصیرتوں کو قرآن سے مربوط کرنے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے ایک مشکل کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ارسطو اور پلوٹینس کا ''اعلیٰ ترین دیوتا'' اللہ سے بہت مختلف تھا۔ نہ تو اس نے دنیا کو تخلیق کیا تھا' نہ ہی اسے دنیاوی واقعات سے غرض تھی نہ ہی اس نے آخری زمانے میں اس کا فیصلہ کرنا تھا۔ جہاں توحید پرست خدا کا تجربہ تاریخی واقعات میں کر چکے تھے وہاں فیلسوف یونانیوں سے متفق تھے کہ دنیا ایک وہم ہے۔ اس کا نہ تو آغاز

ہے نہ درمیان اور نہ اختتام' کیونکہ کائنات اپنی علت اولیٰ سے ابدی طور پر ظہور پذیر ہوئی ہے۔ فیلسفوف تاریخ کے ناپائیدار تغیر سے ماورا ہونے اور اس کے پیچھے موجود الوہی ہستی کی تبدیل نہ ہونے والی مثالی دنیا کا مشاہدہ کرنا سیکھنا چاہتے تھے۔ وہ انسانی عقل کو مطلق عقل یعنی خدا کا عکس سمجھتے تھے۔ تمام غیر عقلی باتوں سے اپنے شعور کو صاف کر کے اور ایک مکمل طور پر عقلی طریقے سے زندگی بسر کر کے الوہی ہستی سے دور ہوتے جانے کے ابدی سلسلے کو روکا جا سکتا ہے نیز اس ارضی زندگی کی پیچیدگی سے بالاتر ہو کر احد (ONE) کی سادگی اور وحدت سے ہم آہنگ ہوا جا سکتا ہے۔ فیلسوفوں کو یقین تھا کہ تزکیہ کا یہ عمل تمام نوع انسان کا اولین مذہب ہے۔ دیگر تمام مسلک تو عقل کے سچے عقیدے کے محض ناکافی چربے ہیں۔

تاہم فیلسوف عمومی طور پر دین دار اشخاص تھے جن کو یقین تھا کہ وہ اچھے مسلمان ہیں۔ ان کی عقلیت پسندی اپنی جگہ ایک قسم کا عقیدہ ہی تھی کیونکہ یہ یقین کرنے کے لئے زبردست جرأت و اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے کہ دنیا کا انتظام عقلی طور پر کیا گیا ہے۔ ایک فیلسوف اپنی زندگی کو عقلی انداز میں بسر کرنے کے لیے وقف کر دیا کرتا تھا۔ وہ اپنے تمام تجربوں اور اقدار کو یکجا کرنے کا خواہش مند ہوتا تھا تا کہ وہ ایک مستحکم' مکمل اور منطقی تصورِ جہاں (ورلڈویو) کو تشکیل دیں۔ ممکنہ طور پر یہ ''توحید'' کا فلسفیانہ روپ تھا۔ جہاں تک سماجی معاملات کا تعلق تھا تو فیلسوف اچھے مسلمان بھی تھے۔ وہ دربار کے عیاشانہ معاشرے اور خلفا کے دولت جمع کرنے کے رجحان کے خلاف تھے۔ ان میں سے کچھ تو معاشرے کو اپنے مثالئے (آئیڈیل) کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ وہ دربار میں اور دیگر امراء کے گھروں میں ماہرین فلکیات اور طبی معالجین کے طور پر کام کرتے تھے اور اس سے ثقافت پر گو محدود سا ہی سہی لیکن نمایاں اثر پڑا۔ تاہم کسی فیلسوف نے علماء کی طرح جامع اصلاح کی کوشش نہیں کی اور شریعت سے ہم آہنگ عوامی مقبولیت والا کوئی نظریہ پیش نہیں کیا۔

یعقوب ابن اسحاق الکندی (وفات 870ء) اسلامی دنیا کا پہلا بڑا فیلسوف یا ''فلسفی'' تھا۔ وہ کوفہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے بصرہ میں تعلیم حاصل کی اور آخرکار بغداد میں آباد ہو گیا جہاں پر اسے خلیفہ مامون کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ دارالخلافہ میں اس نے معتزلہ کے ساتھ مل کر کام تو کیا تاہم وہ انہی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے یونانی دانش وروں سے بھی دانش و حکمت حاصل کی۔ یوں اس نے قرآنی خدا کے وجود کا ثبوت دینے کی خاطر ارسطو کے علت اولیٰ کے وجود کے لئے دئے گئے ثبوتوں کو استعمال کیا۔ بعد میں آنے والے تمام

فیلسوفوں کی طرح اس کو بھی یقین تھا کہ سچ جہاں بھی دستیاب ہو مسلمانوں کو اسے حاصل کرنا چاہئے' خواہ وہ سچ ان سے مختلف عقائد کے حامل غیر ملکی لوگوں کے پاس ہو۔ قرآن میں خدا اور روح کے بارے میں وحی کی گئی تعلیمات مجرد فلسفیانہ سچائیوں کی تمثیلیں ہیں جن کی وجہ سے یہ سچائیاں عام لوگوں کے لئے قابل فہم ہو گئی ہیں جو کہ عقلی سوچ رکھنے کے اہل نہیں ہیں۔ چنانچہ مذہب ''غریب آدمی کا فلسفہ'' تھا۔ الکندی جیسا فیلسوف وحی کو عقل کے تابع نہیں کرتا ہے بلکہ صحیفے کی داخلی روح کا مشاہدہ کرتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح شیعہ قرآن کے باطنی سچ کا مشاہدہ کرتے تھے۔

تاہم اسلامی عقلیت پسندانہ فلسفے کی روایت کو مکمل طور پر استوار کرنے والا ایک ترک ماہر موسیقی تھا۔ ابونصر الفارابی (وفات 950ء) الکندی سے دو قدم آگے بڑھ کر فلسفے کو وحی والے مذہب سے بلندتر قرار دیتا تھا جو اس کے خیال میں محض ایک تقاضائے مصلحت اور ایک فطری معاشرتی ضرورت بن گیا تھا۔ تاہم جہاں الفارابی یونانی عقلیت پسندوں اور عیسائی فلسفیوں سے اختلاف کرتا تھا وہاں وہ سیاست کو بھی اہمیت دیتا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس کا ایمان تھا کہ اسلام کے فتح پانے سے آخرکار ایسے عقلی معاشرے کو تشکیل دینا ممکن ہو گا جہاں افلاطون اور ارسطو کے خوابوں کو تعبیر کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ اسلام اپنے سے پہلے آنے والے مذاہب سے زیادہ عقلیت پسندانہ مذہب ہے۔ اس میں تثلیت جیسے کوئی غیر منطقی عقائد نہیں ہیں اور یہ قانون کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ الفارابی کو یقین تھا کہ برادری کے راہنما کے طور پر امام کے مسلک سمیت شیعی اسلام عام مسلمانوں کو ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کر سکتا ہے جس کا فلسفی بادشاہ عقلی اصولوں کے تحت حکومت کرے گا۔ افلاطون نے کہا تھا کہ اچھی طرح منظم معاشرے کو ایسے فلسفوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بارے میں عام لوگ یقین رکھتے ہوں کہ انہیں دیوتاؤں نے بھیجا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ حضرت محمد ﷺ ایک قانون لے کر آئے تھے' جس کے پیچھے جہنم جیسے سزا کے تصورات تھے' جو عام لوگوں کو منطقی دلائل سے زیادہ اچھے طریقے سے قائل کر سکتے تھے۔ لہٰذا مذہب سیاست کی ایک شاخ ہے اور ایک اچھے فیلسوف ہی کو اس کا مطالعہ کرنا اور اس پر رائے دینا چاہئے کیونکہ ایک اوسط مسلمان کے مقابلے میں وہ عقیدے کے معانی کو زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہے۔

تاہم یہ ایک اہم بات ہے کہ الفارابی ایک عملی صوفی تھا۔ روایت پرست علماء کی نسبت مختلف باطنی گروپ ایک دوسرے سے اتفاق رائے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ جس طرح

شیعہ اور صوفی ایک دوسرے کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اسی طرح صوفیانہ رجحانات رکھنے والے شیعہ اور فیلسوف ایک دوسرے کی طرف مائل تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے سیاسی نظریات مختلف ہوں تاہم روحانی نقطۂ نظر یکساں تھا۔ سنی جماعت کا تصوف ان مکاتب سے مختلف تھا جن کا ذکر ہم بالائی سطور میں کر آئے ہیں' اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک واضح سیاسی فلسفہ وضع نہیں کیا تھا۔ اس کے بجائے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صوفیوں نے تاریخ سے منہ موڑ لیا تھا اور وہ حالاتِ حاضرہ کی بجائے خدا کو اپنی ہستی کی گہرائیوں میں تلاش کرنے لگے تھے۔ تاہم اسلام کی لگ بھگ تمام مذہبی تحریکیں کسی نہ کسی سیاسی تناظر سے ابھری تھیں اور یوں تصوف بھی کوئی استثنا نہیں رکھتا ہے۔ اس کی جڑیں ''زُہد'' میں تھیں جو کہ اموی دور میں اسلامی معاشرے میں بڑھتی ہوئی دنیاداری اور تعیش پسندی کے خلاف ردعمل کے طور پر سامنے آیا تھا۔ یہ امت کی اولین سادگی کو دوبارہ اپنانے کی ایک کوشش تھی کہ جب تمام مسلمان مساویانہ حیثیت میں زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ صوفیا بھی رسول کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے ایسا اونی لباس پہنتے تھے جو کہ غریب مسلمان پہنا کرتے تھے۔ نویں صدی کی ابتدا تک تصوف کی اصطلاح اس باطنی تحریک کے ہم معنی ہوگئی جو کہ عباسی معاشرے میں آہستہ آہستہ پیدا ہوئی تھی۔

تصوف فقہ کے خلاف بھی ایک امکانی ردعمل تھا جس کے بارے میں کچھ مسلمانوں کا خیال تھا کہ وہ اسلام کو خالصتاً خارجی قوانین کے ایک مجموعے کی حد تک گھٹا رہا ہے۔ صوفیا اپنے اندر قلب کی وہی کیفیت دوبارہ تخلیق کرنا چاہتے تھے جس میں حضرت محمد ﷺ نے قرآن کی وحی موصول کی تھی۔ یہ آپ ﷺ کا داخلی اسلام تھا جو کہ قانون کی حقیقی بنیاد تھا نہ کہ فقہا کے اصول الفقہ۔ جہاں ہیئتِ مقتدرہ (اسٹیبلشمنٹ) کا اسلام کم روادار ہوتا جا رہا تھا وہاں صوفیا نے قرآن کو واحد برحق صحیفہ اور حضرت محمد ﷺ کے دین کو واحد سچا دین تسلیم کرتے ہوئے دیگر مذہبی روایات کو اپنا کر قرآن کی روح سے رجوع کیا۔ مثال کے طور پر کچھ صوفیا حضرت عیسیٰؑ سے خاص طور پر عقیدت رکھتے تھے۔ چونکہ انہوں نے محبت کی تبلیغ کی تھی اس لئے وہ صوفیا کے لئے ایک مثالیہ (آئیڈیل) بن گئے تھے۔ بعض دوسروں کا ایمان تھا کہ پتھروں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا مشرک بھی ''حق'' کی پرستش کرتا ہے کیونکہ حق تو ہر شے کے اندر موجود ہے۔

جہاں قرآن ایک انصاف کرنے والے خدا کا ذکر کرتا ہے وہاں حضرت رابعہؒ

(وفات 801ء) جیسی عظیم خاتون جیسے صوفیا محبت کرنے والے خدا کی بات کرتے تھے۔

دنیا بھر میں ہر بڑی مذہبی روایت میں جو مرد وزن اس قسم کے داخلی سفر کی صلاحیت کے حامل تھے انہوں نے چند ایسی خاص تیکنیکیں وضع کر لی ہوئی تھیں جو انہیں لاشعور کی گہرائیوں میں اترنے اور ان کی ہستی کی گہرائیوں میں ایک حضوری جیسی کیفیت کا تجربہ کرنے کے قابل بناتی تھیں۔ صوفیوں نے ایک آہنگ کے ساتھ گہرے سانس لیتے ہوئے اپنی ذہنی قوتوں کے ارتکاز کا طریقہ وضع کیا تھا۔ وہ روزے رکھتے' شب بیداری کرتے اور قرآن میں بیان کئے گئے اللہ کے صفاتی ناموں کا ورد کرتے تھے۔ بعض اوقات اس عمل سے ایک لامحدود مستی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ ایسے صوفیا کو ''وحدت الوجودی صوفیا'' کہا جاتا تھا۔ ایسے اولین وحدت الوجودی صوفیا میں سے ایک صوفی حضرت بایزید بسطامیؒ (وفات 874ء) تھے جو اللہ کو ایک عاشق کی طرح چاہتے تھے۔ تاہم انہوں نے فنا کا مسلک بھی اختیار کیا تھا یعنی انا پرستی کی پرتوں کو بتدریج ہٹاتے جانا (تمام روحانی مصنفین متفق ہیں کہ انا پرستی ہمیں الوہی ہستی کی معرفت حاصل کرنے سے روکتی ہے)۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنی ہستی کے اندر ایک اعلیٰ تر ذات کو پایا جو کوئی اور نہیں خود اللہ تھا۔

کلمۂ شہادت اعلان کرتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' کوئی حقیقت نہیں ہے سو یہ لازماً سچ ہوگا کہ اسلام پر کاملاً عمل پیرا ہونے سے ذات آخر کار ختم ہوتی جاتی ہے۔

حسین المنصور (وفات 922ء) جو کہ الحلاج یعنی 'اون دھنکنے والا' کے نام سے بھی مشہور ہیں' کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے بھی ایک نعرہ لگاتے ہوئے اس سے ملتا جلتا دعویٰ کیا تھا یعنی ''انا الحق!'' (میں حق ہوں یا میں حقیقت ہوں)۔ گو کہ بعض سکالرز کا کہنا ہے کہ اسے یوں پڑھنا چاہئے: ''میں حق کا مشاہدہ کرتا ہوں!''

علما نے حلاج کے اس دعوے پر کہ حج گھر میں رہتے ہوئے ہی روحانی طور پر کرنا ممکن ہے' اسے سزائے موت دلوادی۔ اس کی موت ظاہر کرتی ہے کہ صوفیا اور علما کے مابین کس قدر عداوت موجود تھی۔ حضرت جنید بغدادیؒ (وفات 910ء) جنہیں پہلا ''وحدت الشہودی صوفی'' کہا جاتا ہے' نے اس قسم کی انتہا پسندی کو اختیار نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ جس قسم کی سرور انگیز معرفت حضرت بایزید بسطامیؒ کو ہوئی تھی وہ تو محض ایک مرحلہ تھا اور صوفی کو اس سے بھی بلند تر جانا چاہئے تا کہ وہ ذات کا ایک اعلیٰ تر شعور اور ذات پر زیادہ مکمل اختیار حاصل کر لے۔ جب صوفی نے پہلی مرتبہ الوہی آواز سنی تو وہ مرد یا عورت آگاہ ہو گیا کہ تمام ہستی کے

سرچشمے سے ان کی اذیت ناک علیحدگی عمل میں آ گئی ہے۔ صوفیانہ سفر تو فقط انسانیت کی سچی فطرت کی طرف واپسی ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ تھا جو بدھ مت کے ماننے والوں کے فلسفے سے بہت مشابہہ تھا۔ عباسیوں کے پہلے دور میں تصوف ایک ضمنی تحریک ہی رہا تاہم بعد میں صوفیا نے حضرت جنید بغدادیؒ کی تعلیمات کی بنیاد پر ایک باطنی تحریک تشکیل دی، جس نے ہماری بیان کردہ دوسری تحریکوں کے برخلاف مسلمانوں کی اکثریت کو قائل کر لیا۔

گو کہ تمام صوفیا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ دین دار اور پکے مسلمان ہیں تاہم ان سبھی نے رسول کریم ﷺ کے مذہب کو بدل ڈالا تھا۔ اگر حضرت محمد ﷺ اس وقت موجود ہوتے تو آپ ﷺ فیلسوفوں کے فلسفوں پر حیران رہ جاتے اور حضرت علیؓ یقیناً شیعوں کے تصورات اور قصوں کو تسلیم نہیں کرتے جو کہ آپؓ کے پکے حامی ہونے کے دعوے دار تھے۔ اگرچہ کسی عقیدے پر پختہ ایمان رکھنے والے بہت سے لوگ مانتے ہیں کہ مذہب کبھی تبدیل نہیں ہوتا اور یہ کہ ان کے عقائد اور اعمال اس عقیدے کے بانیوں کے عقائد اور اعمال کے مطابق ہیں، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ بقا کی خاطر مذہب کو تبدیل ضرور ہونا پڑتا ہے۔ مسلمان اصلاح پسندوں نے اسلام کی ان باطنی صورتوں کو غیر مصدقہ پایا اور انہوں نے اولین امت کے خالص عقیدے کی طرف لوٹنے کی کوشش کی جب یہ ایسی آلودگیوں سے پاک تھا۔ تاہم وقت میں پیچھے جانا کبھی ممکن نہیں ہوتا ہے۔ چاہے کوئی بھی ''اصلاح'' ہو اور وہ کتنی ہی روایت پسند ہو، وہ ہمیشہ ایک نیا سفر ہوتی ہے اور اصلاح پسندوں کے اپنے دور کے مخصوص چیلنجوں کے مطابق عقیدے کو ڈھالنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اگر کسی عقیدے کے اندر ارتقا اور نشوونما کے لئے لچک نہیں ہوگی تو وہ فنا ہو جائے گا۔ اسلام نے ثابت کیا کہ وہ یہ تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ان مرد و خواتین کو ایک گہری سطح تک متاثر کر سکتا تھا۔

نویں اور دسویں صدی کے مسلمان مدینہ کی اولین مختصر سی امت کے مسلمانوں سے کوسوں دور چلے گئے تھے۔ ان کے فلسفے، فقہ اور متصوفانہ مسلکوں کی جڑیں قرآن اور رسول کریم ﷺ کی محبوب سیرت میں تھیں۔

اس طرح وہ ان لوگوں سے قرآن کا ذکر کرنے کے قابل ہوئے جو ایسی دنیا میں

رہتے تھے جو رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور سے مختلف تھی۔ تاہم ایک شے مستقل ہی رہی اور وہ یہ کہ اولین امت کی طرح اسلام کا فلسفہ' قانون اور روحانیت گہرائی تک سیاسی تھے۔ مسلمان مکمل طور پر اس امر سے آگاہ تھے___ اور اس کے لئے وہ لائق ستائش ہیں___ کہ جس سلطنت کو انہوں نے تخلیق کیا ہے وہ اپنے تمام تر تابناک ثقافتی کارناموں کے باوجود قرآن کے معیارات پر پورا نہیں اترتی ہے۔ خلیفہ امت کا راہنما تھا مگر وہ اس انداز سے زندگی بسر کرتا اور حکومت کرتا تھا کہ رسول کریم ﷺ دیکھتے تو ناپسند فرماتے۔ جہاں کہیں سیاست حاضرہ اور قرآنی مثالئے (آئیڈیل) کے مابین عدم موافقت نمایاں ہوتی تو مسلمان محسوس کرتے کہ ان کی سب سے زیادہ مقدس اقدار کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ امت کے سیاسی حالات ان کی ہستی کے عمیق ترین مرکز کو چھو سکتے تھے۔ دسویں صدی میں وہ مسلمان' جو زیادہ بصیرت کے حامل تھے' دیکھ سکتے تھے کہ خلافت مشکلات سے دوچار ہے مگر وہ اسلام کی روح سے اس قدر اجنبی تھی کہ مسلمانوں نے اس کے زوال پر ایک آزادی کی طرح خوشی منائی ہوگی۔

✿ ✿ ✿ ✿

حصہ سوم

عروج

ایک نیا نظام

(935ء-1258ء)

دسویں صدی تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اسلامی سلطنت واحد سیاسی اکائی کے طور پر زیادہ مدت برقرار نہیں رہ سکتی۔ خلیفہ امت کا برائے نام سربراہ رہ گیا تھا اور ایک علامتی مذہبی کردار ادا کرتا تھا اور سلطنت کے مختلف حصوں میں عملی طور پر آزاد حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اسماعیلی فاطمیوں کی خلافت کے مرکز مصر1 سے لے کر شمالی افریقہ' شام' بیشتر عرب' فلسطین' عراق' ایران اور وسط ایشیا میں ترک امیروں نے حقیقتاً آزاد و خودمختار حکومتیں قائم کر لی تھیں اور آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ دسویں صدی کو شیعہ صدی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے دوران قائم ہونے والی بہت سے حکومتیں شیعیت کی طرف جھکاؤ رکھتی تھیں۔ تاہم تمام امیر عباسی خلیفہ کو امت کا اعلیٰ ترین راہنما تسلیم کرتے رہے' لہٰذا مطلق بادشاہت کا تصور ہنوز برقرار تھا۔ ان حکومتوں نے کچھ سیاسی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں۔ ایک حکومت تو گیارہویں صدی میں شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک مستقل مرکز قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ تاہم ان میں سے کوئی بھی زیادہ لمبی مدت تک باقی نہیں رہ سکی۔ پھر سلجوقی ترک نمودار ہوئے جنہوں نے 1055ء میں بغداد میں اقتدار پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ کے ساتھ ان کا خصوصی معاہدہ ہو گیا جس کے تحت خلیفہ نے پورے دارالاسلام میں انہیں اپنا نائب مقرر کر دیا۔ سلجوقوں کی فتح سے پہلے کے دنوں میں ایسا لگتا تھا کہ سلطنت کا دائمی انتشار مقدر ہو چکا ہے۔ کیونکہ ایک خاندان دوسرے کی حکومت کو ختم کرتا تو سرحدیں تبدیل ہو جاتیں۔ اگر کوئی بیرونی مشاہدہ کرنے والا دیکھتا تو کہتا کہ کامیابی کے ابتدائی دور کے بعد اسلامی سلطنت زوال پذیر ہو چکی ہے۔

تاہم ایسا مشاہدہ کرنے والا غلطی پر ہوتا۔ درحقیقت تقریباً ایک اتفاق کے تحت ایک نیا نظام ظہور پذیر ہو رہا تھا جو کہ اسلامی روح سے زیادہ موافق تھا۔ سیاسی دشواریوں کے باوجود مذہبِ اسلام زیادہ مستحکم اور مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ ہر مذہب کا کوئی نہ کوئی دارالخلافہ ہوتا ہے' اسلام کے بھی بغداد میں ایک ثقافتی مرکز کے علاوہ کئی نئے دارالخلافہ بن گئے تھے۔ فاطمیوں کے زیرِ حکومت قاہرہ علوم وفنون کا گہوارہ بن چکا تھا۔ وہاں فلسفہ نشوونما پا رہا تھا اور دسویں صدی میں خلفاء نے جامعہ الازہر قائم کی جو آگے چل کر دنیا میں سب سے زیادہ اہم اسلامی یونیورسٹی بن گئی۔ ثمرقند میں فارسی ادبی نشاۃ ثانیہ برپا ہو رہی تھی۔ اس کے درخشاں ستاروں میں سے ایک فیلسوف بوعلی سینا (1037ء -980ء) تھے' جنہیں مغرب میں ایوی سینا (Avicenna) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ابن سینا الفارابی کے شاگرد تھے تاہم مذہب کو زیادہ سنجیدگی سے لیتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق پیغمبر مثالی فلسفی ہوتا ہے۔ وہ عام لوگوں تک محض مجرد سچ کو پہنچانے والا نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان بصیرتوں تک پہنچ چکا ہوتا ہے جن کا انحصار منتشر افکار پر نہیں ہوتا۔ ابن سینا تصوف میں دلچسپی رکھتے تھے اور اعتراف کرتے تھے کہ صوفی الوہی ہستی کی معرفت حاصل کر سکتا ہے جبکہ کوئی شخص منطقی عمل سے اس تک رسائی نہیں پا سکتا تاہم اس کا فلسفیانہ تصورات سے ربط ضرور ہے۔ فلسفہ اور صوفیوں کا عقیدہ دونوں ہی روایت پسند عبادت گزاروں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

قرطبہ بھی ثقافتی رنگا رنگی سے معمور تھا' اگرچہ 1010ء میں سپین میں اموی خلافت بالآخر منہدم ہو گئی اور بہت سے آزاد مگر باہم دشمن درباروں میں تقسیم ہو گئی۔ سپینی نشاۃ ثانیہ اپنی شاعری کی وجہ سے خاص طور پر مشہور تھی جو کہ قرون وسطیٰ کے فرانسیسی درباروں کی عشقیہ شاعری کی روایت سے مشابہہ ہے۔ مسلمان شاعر ابن حزم (1064ء-994ء) نے احادیث کی اساس پر ایک زیادہ سادہ مسلک وضع کیا اور پیچیدہ فقہ نیز مابعدالطبیعیاتی فلسفے کو خارج کر دیا۔ بااین ہمہ سپین کے بعد میں آنے والے دانشور ستاروں میں سے ایک ابوالولید احمد ابن رُشد (98-1126ء) تھے' جو تصوف کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھنے والے ابن سینا کی نسبت اسلامی دنیا میں کم اہم شمار کئے جاتے تھے تاہم ان کے عقلیت پسندانہ افکار نے میمونائیڈز' تھامس ایکویناس اور البرٹ دی گریٹ جیسے یہودی اور عیسائی فلسفیوں کو متاثر کیا۔ انیسویں صدی میں ماہر لسانیات ارنسٹ رینان نے ابن رشد کو (جو مغرب میں Averroes مشہور ہیں) آزاد روح اور اندھے عقیدے کے خلاف عقلیت پسندی کا اولین حامی کہتے ہوئے

خراج تحسین پیش کیا۔ ابن رشد حقیقت میں ایک پکے مسلمان تھے اور وہ شرعی قانون کے جج یعنی قاضی تھے۔ ابن سینا کی طرح وہ بھی یقین رکھتے تھے کہ مذہب اور فلسفے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ لیکن مذہب ہر کسی کے لئے ہوتا ہے جبکہ فلسفہ صرف دانشور اشرافیہ کے لئے مخصوص ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ جب خلافت عملی طور پر ختم ہوگئی تو اسلام نے نئی زندگی حاصل کر لی۔ قرآن اور مطلق بادشاہت کے آدرشوں میں ہمیشہ تناؤ موجود رہا تھا۔ اسلامی دنیا میں سعی و خطا کے عمل کے ذریعے جو سیاسی حکمت عملیاں ظہور پذیر ہورہی تھیں وہ اسلامی وژن سے قریب تر تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ تمام نئے حکمران زاہد و متقی مسلمان تھے تاہم ایک ڈھیلے ڈھالے قوی اتحاد میں شامل ایک دوسرے کے برابر آزاد درباروں اور حکمرانوں کا نظام قرآن کی مساویانہ روح کے ساتھ زیادہ حقیقی طور پر ہم آہنگ تھا۔ اس دور میں اسلامی دنیا میں ابھرنے والا فن بھی قرآن کی روح سے مطابقت رکھتا تھا۔ طغروں میں کسی ایک لفظ پر زیادہ اور دوسرے پر کم زور نہیں دیا جاتا تھا بلکہ ہر لفظ اپنی جگہ سجا ہوتا تھا اور کُل کو تشکیل دینے میں اپنا منفرد کردار ادا کرتا تھا۔ ابن اسحٰق اور ابو جعفر الطبری (وفات 923ء) جیسے مسلمان تاریخ نویسوں نے رسول کریم ﷺ کی حیات مبارکہ کے حوالے سے متنازعہ روایتوں کو غیر متنازعہ اور باہم موافق بنانے کی تھوڑی سی کوشش کی مگر ایک دوسرے سے مخالفانہ نسخے ہی پیش کر پائے۔ مسلمانوں نے خلافت کو قبول کر لیا تھا کیونکہ وہ امت کے اتحاد کی ضمانت تھی مگر جب ایک مرتبہ خلفاء نے ظاہر کر دیا کہ وہ سلطنت کو مزید متحد نہیں رکھ سکتے تو انہیں ایک علامتی درجے پر فائز کر دیا گیا اور انہیں اسی پر قناعت کرنا پڑی۔ اس وقت تک لگ بھگ ہمیشہ الٰہیات اور روحانیت کی جڑیں اسلامی برادری کے تاریخی حالات کے ردعمل میں رہی تھیں۔ تاہم اب مسلمانوں نے زیادہ موافقانہ سیاسی انتظامات کر لئے تھے اور اب مسلمانوں کی سوچ اور وفاداری کا محرک حالاتِ جاریہ کم ہی رہ گئے تھے۔ خاص طور پر اسلام جدید دور میں تب ایک بار پھر زیادہ سیاسی ہو گیا جب مسلمان نئے مسائل سے دوچار ہوئے جنہوں نے ان کے خیال کے مطابق امت کی اخلاقی، ثقافتی اور مذہبی بہتری کو خطرے میں ڈال دیا تھا اور یہاں تک کہ اس کی بقا بھی مخدوش ہوگئی تھی۔

سلجوقی ترکوں نے منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں بلکہ اتفاقیہ طور پر ''زرخیز ہلال'' میں نئے نظام کو مکمل طور پر نافذ کیا جس میں عدم مرکزیت (ڈی سنٹرلائزیشن) کا رجحان زیادہ غالب تھا۔ سلجوق سنی تھے اور ان کا تصوف کی طرف زیادہ جھکاؤ تھا۔ ان کی سلطنت پر 1063ء سے 1092ء تک ذہین ایرانی وزیر نظام الملک نے حکومت کی، جو چاہتا تھا کہ ترکوں کو استعمال

کر کے سلطنت کو دوبارہ متحد کر دے اور پرانی عباسی انتظامیہ (بیورو کریسی) کی تشکیل نو کرے۔ لیکن بغداد کے احیاء میں بڑی تاخیر ہو گئی تھی کیونکہ زرعی علاقہ سواد' جو کہ اس کی معیشت کی بنیاد تھا' رو کے نہ جا سکنے والے زوال کی زد میں آ گیا تھا۔ اسی طرح نظام الملک سلجوق فوج کو بھی قابو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ فوج بدو قبائلیوں پر مشتمل تھی جو اپنے ہی قوانین کی اطاعت کرتے تھے اور جہاں جی چاہتا اپنے ریوڑوں کے ساتھ وہیں چلے جاتے۔ تاہم غلام فوجیوں کے ایک نئے لشکر کی مدد سے اس نے سلطنت کی حدوں کو جنوب میں یمن تک' مشرق میں دریائے جیحوں کے طاس تک اور مغرب میں شام تک وسعت عطا کر دی۔ اس نئی سلجوق سلطنت میں رسمی سیاسی ادارے موجود نہیں تھے بلکہ علما اور امیر' جن میں ظاہری طور پر شراکت باہمی ہو گئی تھی' مقامی سطح پر ہی قانون کا نفاذ کرتے تھے۔ مختلف اضلاع پر حکومت کرنے والے امیر نظام الملک کے مرکزیت پسندانہ منصوبے کو نظر انداز کرتے ہوئے حقیقتاً آزاد و خودمختار ہو گئے تھے اور بغداد سے محاصل کا حصہ لینے کی بجائے لوگوں سے زرعی محصولات خود براہِ راست وصول کرنے لگے تھے۔ وہ کوئی جاگیردارانہ نظام نہیں تھا کیونکہ وزیر کی نیت و ارادہ جو کچھ بھی ہو امیر خلیفہ یا سلجوق سلطان ملک شاہ کے اطاعت گزار نہیں تھے۔ امیر بدو تھے جنہیں اپنے علاقے میں کھیتی باڑی کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوا کرتی سو انہوں نے جاگیردارانہ اشرافیہ کو تشکیل نہیں دیا۔ وہ سپاہی تھے اور انہیں اپنی رعایا کی شہری زندگی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علما کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

علما نے ان بکھری ہوئی حکومتوں کو یکجا کیا۔ دسویں صدی کے دوران وہ ان کے معیارِ تعلیم سے مطمئن نہیں رہے تھے اور انہوں نے پہلا مدرسہ یعنی اسلامی سائنسوں کے مطالعہ کے لئے کالج قائم کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی تربیت زیادہ منظم ہو گئی' ان کی تعلیم و تدریس زیادہ یکساں ہو گئی اور مذہبی پیشوائیت کا رتبہ بڑھ گیا۔ نظام الملک نے پوری سلجوق سلطنت میں مدرسوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے نصابوں میں ایسے مضامین کا اضافہ کروایا جن کو پڑھ کر علما مقامی حکومت میں کام کرنے کے اہل ہو جاتے تھے۔ اس نے 1067ء میں مؤقر مدرسۂ نظامیہ قائم کیا۔ اب جبکہ علما کے پاس اپنے ادارے تھے' انہیں قوت کا ایک مرکز حاصل ہو گیا جو کہ امیروں کے فوجی درباروں سے مختلف مگر برابر ہو گیا تھا۔ مستند مدرسوں نے پوری سلجوقی سلطنت میں شریعت سے صورت پذیر ہونے والے ایک قسم کے اسلامی طرز زندگی کو فروغ دیا۔ علما نے اپنی شرعی عدالتوں کے ذریعے قانون کے نظام پر بھی

اجارہ داری قائم کر لی تھی۔ اس طرح سیاسی اقتدار اور برادری کی شہری زندگی میں ایک خاموش تقسیم واقع ہو گئی۔ امیروں کی زیر حکمرانی چھوٹی ریاستوں میں سے کوئی ایک بھی زیادہ عرصہ نہیں چلی کیونکہ وہ کوئی سیاسی نظریہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ امیر بہت ہی عارضی کردار تھے اور سلطنت کا سارے کا سارا آئیڈیلزم علما اور پیروں کا فراہم کردہ تھا جو اپنی الگ ہی دنیا رکھتے تھے۔ فاضل علما مختلف مدرسوں میں جایا کرتے تھے۔ جبکہ صوفی پیر تو گھومنے پھرنے کے لئے بدنام تھے' وہ مختلف قصبوں اور مراکز کا سفر کرتے رہتے تھے۔ مذہبی لوگوں نے منتشر معاشرے کو ایک لڑی میں پرونا شروع کر دیا۔

یوں باثر خلافت کے ختم ہو جانے کے بعد سلطنت زیادہ اسلامی ہو گئی۔ مسلمانوں نے خود کو امیروں کی عارضی ریاستوں سے تعلق رکھنے والا محسوس کرنے کی بجائے علما کے زیادہ بین الاقوامی معاشرے کا فرد تصور کرنا شروع کر دیا جو کہ پورے دارالاسلام کے ساتھ وسعت پذیر تھا۔ علما نے شریعت کو نئے حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اسلامی قانون استعمال کر کے جوابی ثقافت تشکیل دینے کی بجائے شریعت اب خلیفہ کو مقدس قانون کے علامتی سرپرست کے طور پر دیکھنے لگی۔ امیر آتے جاتے رہے اور علما شریعت سے حاصل کردہ طاقت کے ساتھ واحد مستحکم مقتدرہ (اتھارٹی) بن گئے۔ اس کے علاوہ جوں جوں تصوف زیادہ مقبول و معروف ہوتا گیا لوگوں کا زہد وتقویٰ گہرا ہوتا گیا اور اس نے ایک داخلی جہت حاصل کر لی۔

ایسا لگتا تھا کہ سنی مسلک ہر جگہ عروج پر ہے۔ فاطمی خلافت کے امت پر سچے عقیدے کے نفاذ میں ناکام ہونے کے بعد رنج ناکامی میں مبتلا کچھ زیادہ انقلابی اسماعیلیوں نے گوریلاؤں کا ایک زیر زمین نیٹ ورک قائم کر لیا۔ وہ سلجوقوں کو اقتدار سے بے دخل کرنا اور سنت کو تباہ کر دینے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ 1090ء سے انہوں نے شمالی قزوین میں واقع اپنے پہاڑی قلعے الموت سے حملوں کا آغاز کیا۔ انہوں نے سلجوقوں کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور نمایاں امیروں کو قتل کر ڈالا۔ 1092ء تک یہ رجحان ایک بھرپور انقلاب میں ڈھل گیا۔ انقلابیوں کو ان کے دشمنوں نے حشیشین (جس کو ہم Assassin بولتے ہیں) کہنا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کہا جاتا تھا کہ وہ خود میں ایسے حملوں کی جرأت پیدا کرنے کے لئے' جوان کی اپنی موت کا باعث بن سکتے تھے' حشیش استعمال کیا کرتے تھے۔ اسماعیلیوں کا ایمان تھا کہ وہ عام لوگوں کے حقوق کے محافظ ہیں' جنہیں امیر خوفزدہ کئے رکھتے ہیں۔ تاہم دہشت کی اس مہم نے بیشتر مسلمانوں کو اسماعیلیوں کے خلاف کر دیا۔ علما نے ان کے خلاف وحشت

انگیز اور من گھڑت کہانیاں پھیلا دیں (حشیش کا افسانہ انہیں من گھڑت کہانیوں میں سے ایک ہے)۔ جن لوگوں کے بارے میں شبہ ہو جاتا کہ وہ اسماعیلی ہیں انہیں گرفتار کر لیا جاتا اور پھر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا جبکہ اس قتل عام سے مزید اسماعیلی حملوں کی راہیں کشادہ ہوتی تھیں۔ تاہم اس مخالفت کے باوجود اسماعیلی الموت کے اردگرد ایک ریاست تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے جو کہ ڈیڑھ سو برس تک قائم رہی اور جسے صرف منگول حملہ آور ہی تباہ و برباد کر سکے۔ ان کے جہاد کا فوری اثر ویسا نہیں تھا جیسا کہ ان کی امید تھی یعنی حضرت مہدیؑ کا ظہور بلکہ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ سارے شیعہ ہی بے اعتبار ہو کر رہ گئے۔ بارہ اماموں کو ماننے والے شیعوں نے محتاط روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سنی حکمرانوں کی اطاعت گزاری ظاہر کر کے انہیں اپنے حق میں دھیما کر لیا تھا اور کسی بھی سیاسی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوئے۔

ابو حامد محمد الغزالی (وفات 1111ء) وزیر نظام الملک کے ایک متوسل تھے۔ وہ بغداد میں مدرسۂ نظامیہ میں استاد تھے اور اسلامی قانون کے ماہر تھے۔ 1095ء میں انہیں نروس بریک ڈاؤن (نظام اعصاب کی ناکارگی) کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے زمانے میں اسماعیلی انقلاب اپنے عروج پر تھا تاہم الغزالی اس امکان سے بہت زیادہ دل شکستہ تھے کہ وہ اپنے عقیدے سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ مفلوج ہو گئے ہیں اور بولنے سے قاصر ہیں۔ ان کے معالجین نے ایک گہری جذباتی پیچیدگی تشخیص کی۔ اور بعدازاں الغزالی نے وضاحت کی کہ وہ متفکر رہتے تھے کہ وہ خدا کے بارے میں تو بہت کچھ جانتے ہیں تاہم خود خدا کو نہیں جانتے۔ چنانچہ وہ یروشلم گئے' تصوف کی ریاضتیں کیں اور دس برس بعد عراق واپس آئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ''احیاء العلوم الدین'' لکھی۔ قرآن اور احادیث کے بعد سب سے زیادہ حوالے اس کتاب سے دئے جاتے ہیں۔ اس کی بنیاد یہ اہم نکتہ ہے کہ صرف رسومات اور عبادت ہی انسان کو خدا کا براہِ راست علم عطا کر سکتی ہے' علم الکلام اور فلسفہ ہمیں خدا کے بارے میں کوئی یقینی علم مہیا نہیں کر سکتے۔ ''احیاء العلوم'' میں مسلمانوں کو اس مذہبی تجربے کے لئے تیار کرنے کی غرض سے روزانہ کا روحانی اور عملی ضابطہ مہیا کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں کھانے' سونے' نہانے دھونے' صحت اور عبادت کے تمام شرعی قوانین کی عقیدتی اور اخلاقی تعبیر و تشریح کی گئی ہے تا کہ وہ محض خارجی ہدایت نامے ہی نہ رہ جائیں بلکہ مسلمانوں میں اس شعور کو پروان چڑھائیں جس کی وکالت قرآن کرتا ہے۔ یوں شریعت معاشرتی موزونیت کے وسیلے سے زیادہ اہم شے بن گئی تھی اور رسول کریم ﷺ کی سنت کی

ایک خارجی پیروی‘ جس کے ذریعے داخلی اسلام کا حصول ممکن ہوتا تھا۔ الغزالی نے مذہبی ماہروں کے لئے نہیں بلکہ متقی افراد کے لئے یہ کتاب تحریر کی تھی۔ ان کو یقین تھا کہ لوگوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں: اول ایسے لوگ جو مذہب کی سچائیوں کو بغیر سوالات کئے قبول کر لیتے ہیں‘ دوم ایسے لوگ جو علم الکلام کے ذریعے اپنے عقائد کا جواز تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں‘ اور سوم صوفیاء جو مذہبی سچائیوں کی براہِ راست معرفت حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔

الغزالی کو اس حقیقت کا علم تھا کہ ان نئے سیاسی حالات میں لوگوں کو مختلف مذہبی حل درکار ہیں۔ وہ اسماعیلیوں کے امام معصوم کے نظریے کو ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ ایسا امام کہاں ہے؟ عام لوگ اسے کس طرح پا سکتے ہیں؟ ان کا کہنا تھا کہ کسی مقتدر شخصیت پر اس نوع کا انحصار قرآن کے مساوات کے نظریے کی خلاف ورزی معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ فلسفہ ریاضی اور طب جیسے علوم کے لئے ناگزیر ہے تاہم یہ عقل کے دائرے سے بالاتر روحانی معاملات میں کوئی لائق اعتماد رہنمائی فراہم نہیں کرسکتا۔ امام الغزالیؒ کے خیال میں تصوف اس مسئلے کا حل ہے کیونکہ اس کے ذریعے الوہی ہستی کا براہِ راست ابلاغ ممکن ہے۔ ابتدائی زمانے میں علما تصوف سے چونک پڑے تھے اور اسے ایک خطرناک تحریک تصور کرتے تھے۔ اب امام الغزالیؒ نے زور دے کر کہا کہ علما کو صوفیا کی وضع کردہ مراقباتی رسومات پر عمل کرنا چاہئے اور شریعت کے خارجی قوانین کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ داخلی روحانیت کو بھی فروغ دینا چاہئے۔ اسلام کے لئے دونوں ہی اہم ہیں۔ امام الغزالیؒ نے اپنے وقار اور اختیار کو استعمال کر کے تصوف کو اسلامی زندگی کے مرکزی دھارے میں شامل کیا۔

امام الغزالیؒ کو ان کے اپنے عہد میں اعلیٰ ترین مذہبی سند تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس عرصے کے دوران تصوف اشرافیہ تک محدود نہیں رہا بلکہ ایک مقبول عام تحریک بن گیا اب جبکہ لوگوں کا ایمان ابتدائی زمانوں کی طرح امت کی سیاست سے مشروط نہیں رہا تھا تو وہ تصوف کے ایک غیر تاریخی‘ اساطیری داخلی سفر کے لئے تیار تھے۔ ”ذکر“ باطن پرست مسلمانوں کی خلوت آمیز سرگرمی کی بجائے پیر کی رہنمائی میں شعور کی ایک متبادل حالت کے حصول کی اجتماعی سرگرمی بن گیا۔ صوفیا اپنے ماورائیت کے ادراک کو رفعت عطا کرنے کے لئے موسیقی سنتے تھے۔ وہ اپنے پیروں کے گرد اس طرح مجتمع ہو گئے جس طرح کبھی شیعہ اپنے اماموں کے گرد اکٹھے ہوئے تھے اور انہیں خدا کی طرف راہنمائی کرنے والے کے طور پر دیکھنے لگے۔ جب کوئی پیر فوت ہو جاتا تو اسے بہت زیادہ تقدیس حاصل ہو جاتی اور لوگ اس کے مزار پر جا

کر عبادت اور ذکر کیا کرتے تھے۔ اب ہر قصبے میں مسجد اور مدرسے کی طرح خانقاہ بھی ہوا کرتی تھی جہاں مقامی پیر اپنے عقیدت مندوں کو درس دیتا تھا۔ تصوف کے نئے طریق تشکیل دیئے گئے جو کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں تھے بلکہ بین الاقوامی تھے اور ان کی شاخیں پورے دارالاسلام میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس طرح عدم مرکزیت والی سلطنت میں یہ طریق اتحاد کا ایک اور سرچشمہ بن گئے۔ اسی طرح ہر قصبے میں دست کاروں اور تاجروں کی انجمنیں وجود میں آ گئیں جو صوفیانہ آدرشوں سے بہت زیادہ متاثر تھیں۔ اسلامی ادارے سلطنت کو زیادہ سے زیادہ متحد کرنے لگے اور ٹھیک اسی زمانے میں غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کا عقیدہ ایک داخلی گونج حاصل کر رہا تھا جو کہ کبھی ایک باطن پرست اشرافیہ تک ہی محدود تھا۔

اس وقت تک اسلام میں کوئی ایسا الٰہیاتی یا فلسفیانہ نظام نہیں رہا جو روحانیت سے گہرائی تک متاثر نہ ہو۔ نئے ''الٰہیاتی فلسفیوں'' نے نئے اسلامی فکری امتزاج پیش کرنے شروع کر دیئے۔ حلب' میں یحییٰ سہروردی (وفات 1191ء) نے الاشراق کا مکتب قائم کیا جس کی بنیاد اسلام سے پہلے کی ایرانی باطنیت تھی۔ انہوں نے فلسفے کو تربیت یافتہ ذہن اور تصوف کے ذریعے تبدیل شدہ دل کا ملاپ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ عقل اور تصوف کو ساتھ ساتھ چلنا ہوگا' انسانوں کے لئے دونوں جوہری اعتبار سے اہم ہیں اور سچ کی تلاش میں دونوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صوفیاء کی بصیرتوں اور قرآن کی علامتوں کو تجرباتی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ مراقبہ کرنے والا اپنے تربیت یافتہ وجدان کے ذریعے ان کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ صوفیانہ جہت سے باہر مذہب کے قصوں کی کوئی معنویت نہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح سے ''حقیقی'' نہیں ہیں جس طرح کہ دنیاوی مظاہر' جن کا تجربہ ہم اپنے معمول کے بیدار شعور کے ذریعے کرتے ہیں۔ ایک عورت یا مرد صوفی الوہی ہستی کی داخلی جہت کا مشاہدہ کرنے کے لئے تصوف کے اصولوں کے ذریعے اپنی تربیت کرتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے اندر ہماری دنیا اور خدا کے درمیان موجود ''عالم المثال'' کا شعور پیدا کرنا ہوگا۔

یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو تربیت یافتہ صوفی نہیں تھے اس دنیا سے خواب میں یا تنویمی تخیل کے ذریعے آگاہ ہوئے۔ یحییٰ سہروردی کا ایمان تھا کہ جب کوئی پیغمبر یا صوفی بصیرت کا حامل ہوتا ہے تو وہ اس داخلی جہان سے آگاہ ہو چکا ہوتا ہے' اس کو ہم آج کی لفظیات میں لاشعور کہہ سکتے ہیں۔

اسلام کی یہ قسم حضرت حسن بصریؒ یا امام شافعیؒ کے لیے ناقابل قبول تھی۔ یحییٰ

سہروردی کو ان کے نظریات پر سزا تو ملی تاہم وہ ایک پکے مسلمان تھے جنہوں نے قرآن پاک کے حوالے ہر سابقہ فیلسوف سے زیادہ دیئے تھے۔ ان کی تصنیفات کا آج بھی تصوف کے کلاسیکوں کے طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہسپانوی الٰہیاتی فلسفی معیدالدین ابن العربی (وفات 1240ء) کی کتابیں پرازمعنی اور انتہائی اثرانگیز ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں پر یہ بھی زور دیا کہ وہ عالم المثال کو اپنے اندر ہی دریافت کریں اور اس بات کا درس دیا کہ تخلیقی تخیل کے ذریعے خدا تک پہنچا جاسکتا ہے۔ ابن العربی کی کتابیں آسان نہیں تھیں اور ان میں زیادہ دانش ور مسلمانوں کے لیے کشش تھی تاہم ان کا ایمان تھا کہ ہر شخص صوفی بن سکتا ہے اور ہر شخص کو قرآن کے علامتی پوشیدہ معانی کو سمجھنا چاہیے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر شے اور ہر جگہ سطح کے نیچے موجود مقدس موجودگی کا اپنے تخیل کے ذریعے مشاہدہ کریں۔ ہر انسان خدا کی پوشیدہ صفات کا منفرد اور دہرایا نہ جانے والا انکشاف ہے اور ہماری انتہائی داخلی ذات میں جو الوہی اسم نقش ہے وہ خدا ہی کا تو ہے۔ شخصی مالک (Lord) کے اس تصور کو وہ عقیدہ دبا دیتا ہے جس میں کوئی شخص پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا صوفی کو ہر عقیدے کو مساوی طور پر درست ماننا چاہیے اور سیناگوگ، مسجد، مندر یا چرچ کو مختلف نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ خدا قرآن میں کہتا ہے:
''تم جس طرف بھی رُخ کرتے ہو اُدھر اللہ ہوتا ہے۔'' 2

اس طرح خلافت کے زوال پا جانے کے بعد ایک مذہبی انقلاب بپا ہو چکا تھا۔ اس نے مسلمہ دانش وروں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو بھی متاثر کیا۔ ایسے سچے مسلمان سامنے آئے جو مذہب پر ایک گہری سطح پر عمل کرنا سیکھ چکے تھے۔ مسلمانوں نے سیاسی بربادی کا مداوا ایک ہمہ گیر روحانی احیا کی صورت میں پایا، جس میں نئی صورتحال سے نمٹنے کے لیے عقیدے کی نئی تعبیر کی گئی۔ اب اسلام حکومت کی سرپرستی کے بغیر ہی فروغ پا رہا تھا۔ درحقیقت سیاسی افراتفری سے دوچار دنیا میں صرف اسلام ہی مستحکم تھا۔

✿ ✿ ✿ ✿

صلیبی جنگیں

سلجوق ترکوں کے تحت وجود میں آنے والا سیاسی اعتبار سے خودمختار امیروں کا نیا نظام گیارہویں صدی کے اختتام پر سلطنت کے انتشار کے بعد بھی قائم رہا۔ اس نظام میں واضح خامیاں موجود تھیں۔ امیر آپس میں جنگیں لڑتے رہتے تھے اور کسی بیرونی دشمن کے مقابلے کے لیے متحد ہونا دشوار پاتے تھے۔ یہ حقیقت جولائی 1099ء میں اس وقت المناک انداز میں نمایاں ہوگئی، جب مغربی یورپ سے آنے والے صلیبی جنگجوؤں کے لشکروں نے مکہ اور مدینہ کے بعد اسلامی دنیا کے تیسرے سب سے زیادہ مقدس شہر یروشلم پر حملہ کر کے اس کے شہریوں کا قتل عام کیا اور فلسطین، لبنان اور اناطولیہ میں ریاستیں قائم کیں۔ سلجوق سلطنت کے زوال کے بعد آپس میں لڑنے والے امیر متحد نہ ہوئے اور مغرب کی اس جارحانہ یورش کے خلاف بے بس دکھائی دیئے۔ اس کے پچاس برس بعد 1144ء میں موصل اور حلب کا امیر عمادالدین زنگی صلیبی لشکر کو آرمینیا سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے نصف صدی بعد 1187ء میں ایک کرد جرنیل یوسف بن ایوب صلاح الدین نے جسے ہم مغرب والے ''سلاڈن'' (Saladin) کہتے ہیں، صلیبیوں سے یروشلم دوبارہ حاصل کرلیا تاہم صلیبی تیرہویں صدی کے اواخر تک ساحل کے ساتھ ساتھ مشرقِ قریب پر قبضہ جمائے رکھنے میں کامیاب رہے۔ اسی بیرونی خطرے کی وجہ سے صلاح الدین کی قائم کی ہوئی حکومت ''زرخیز ہلال'' میں دوسرے امیروں کی عارضی نوعیت کی ریاستوں کے مقابلے میں بہت زیادہ لمبی مدت تک برقرار رہی۔ صلاح الدین نے اپنی مہم کے ابتدائی مرحلے میں مصر میں فاطمیوں کو شکست دی، ان کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور اس کے شہریوں کو سنی مسلک کی طرف واپس لایا۔

مغربی تاریخ میں صلیبی جنگیں شرمناک مگر اہمیت کی حامل ہیں۔ ان جنگوں میں صلیبیوں نے مشرقِ قریب کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کردیا تھا تاہم عراق' ایران' وسط ایشیا' ملائیشیا' افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان کی حیثیت دوردراز کے سرحدی سانحات کی سی ہی تھی۔ ایسا تو بیسویں صدی میں جا کر ہوا کہ جب مغرب زیادہ طاقتور اور مسلمانوں کے لیے زیادہ خطرے کا باعث ہوگیا تو مسلمان تاریخ نویس وسطی عہد کی صلیبی جنگوں کا اثر قبول کرنا شروع ہوئے اور فاتح صلاح الدین ایوبی جیسے کسی لیڈر کی آرزو کرنے لگے جو مغربی استعماریت کی نئی صلیبی جنگوں کا مقابلہ کرسکے۔

توسیع

صلیبی جنگوں کی فوری وجہ یہ تھی کہ سلجوقوں نے فاطمیوں کے زیر حکومت شام کو 1070ء میں فتح کرلیا۔ اپنی اس مہم کے دوران بازنطینی سلطنت کے ساتھ بھی ان کی جنگیں شروع ہوگئیں۔ بازنطینی سلطنت کا سرحدی دفاع بہت کمزور تھا۔ سلجوق شاہ سوار بازنطینی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے اناطولیہ میں داخل ہوگئے اور انہوں نے 1071ء میں مینز یکرٹ کی جنگ میں بازنطینیوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ دس ہی برسوں کے اندر اندر حالت یہ ہوئی کہ ترک خانہ بدوش اپنے ریوڑوں کے ساتھ اناطولیہ میں آزادانہ گھومنے پھرنے لگے اور امیروں نے وہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں۔ ان امیروں کو افرادی قوت ان مسلمانوں کی صورت میں میسر آئی جو اناطولیہ کو مواقع کی سرزمین تصور کرتے تھے۔ ترکوں کی اس پیش رفت کو روکنے سے لاچار بازنطینی بادشاہ الکیکس کومنیس اول (Alexius Comnenus I) نے 1091ء میں پوپ سے مدد کی درخواست کی اور اس درخواست کے جواب میں پوپ اربن دوم (Urban II) نے پہلا صلیبی لشکر بھیجا۔ صلیبیوں نے اناطولیہ کے مختلف حصوں پر قبضہ تو قائم کرلیا تاہم وہ علاقے میں ترک فتوحات کا سلسلہ زیادہ عرصے تک روک نہیں سکے۔ تیرہویں صدی کے اختتام تک ترک بحر روم تک پہنچ چکے تھے۔ چودھویں صدی کے دوران انہوں نے بحیرۂ ایجیئن کو پار کیا' بلقان میں آبادیاں قائم کیں اور دریائے ڈینیوب تک پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کبھی کوئی مسلمان بادشاہ قدیم رومی سلطنت کی عظمت کے وارث بازنطین کو ایسی شکست نہیں دے پایا تھا۔ چنانچہ ترکوں نے بھی فخریہ طور پر اناطولیہ میں

اپنی نئی ریاست کو ''روم'' کہنا شروع کر دیا۔ خلافت کے زوال کے باوجود مسلمان اب دو ایسے علاقوں تک وسعت پا چکے تھے جو پہلے کبھی دارالاسلام کا حصہ نہیں رہے تھے یعنی مشرقی یورپ اور جنوب مغربی ہندوستان کا ایک حصہ۔ یہ علاقے جلد ہی انتہائی تخلیقی علاقوں میں تبدیل ہو گئے۔

خلیفہ الناصر (1225ء۔ 1190ء) نے بغداد اور اس کے گردونواح میں خلافت کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ مذہبی احیاء کی قوت کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس نے اسلام کا سہارا لینے کی سعی کی۔ حقیقت میں تو شریعت خلفاء کے اقتدار کے خلاف احتجاج کے طور پر تشکیل پا رہی تھی۔ تاہم اب الناصر نے سنّیوں کے چاروں فقہی مکاتبِ فکر کا عالم بننے کے لیے مطالعہ شروع کیا۔ اس نے فتوؤں کے ذریعے بھی بغداد میں اپنی حیثیت کو مستحکم کیا۔ الناصر کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں نے اس کی پالیسیوں کو جاری رکھا۔ تاہم بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ اسلامی دنیا میں جلد ہی ایک المناک صورتحال رونما ہوئی جس کے نتیجے میں عباسی خلافت ایک متشددانہ اور المیہ انجام سے دوچار ہوئی۔

✿ ✿ ✿ ✿

منگول

(1220ء۔1500ء)

مشرق بعید میں منگول سردار چنگیز خان ایک عالمی سلطنت کو تشکیل دے رہا تھا اور اسلام سے اس کا ٹکراؤ ناگزیر ہو چکا تھا۔ سلجوقوں کے برعکس اس نے اپنے خانہ بدوش فوجیوں کو قابو میں رکھا اور انہیں نظم و ضبط کا پابند بنا دیا۔ اس نے انہیں ایک تباہ کن قوت والی ایسی جنگجو فوج میں ڈھال دیا جس کا دنیا نے پہلے کبھی مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ جو بھی حکمران منگول سردار کی فوری اطاعت قبول نہ کرتا اسے اپنے بڑے بڑے شہروں کی مکمل تباہی و بربادی اور اپنی رعایا کا قتل عام دیکھنا پڑتا۔ منگولوں کی یہ سفاکی نہ صرف ایک سوچی سمجھی تیکنیک تھی بلکہ شہری ثقافت سے خانہ بدوشوں کی نفرت کا اظہار بھی کرتی تھی۔ جب خوارزمی ترکوں کے شاہ محمد (1220ء۔1200ء) نے ایران اور دریائے جیحوں کے علاقے میں اپنی خلافت قائم کرنے کی کوشش کی تو منگول سپہ سالار ہلاکو نے اسے ایک توہین آمیز اقدام تصور کیا۔ 1219ء سے 1229ء تک منگول فوجیں محمد اور اس کے بیٹے جلال الدین کا تعاقب کرتے ہوئے سارے ایران' آذربائیجان اور شام میں قتل و غارت کرتی اور تباہی و بربادی پھیلاتی رہیں۔ 1231ء میں حملوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوا۔ عظیم مسلمان شہروں کو یکے بعد دیگرے نیست و نابود کر دیا گیا۔ بخارا کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا' بغداد کو ایک مختصر سی جنگ کے بعد تباہ کر دیا گیا اور لبِ مرگ خلافت بھی اس کے ساتھ ہی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ گلیاں لاشوں سے اٹی پڑی تھیں اور لوگ جانیں بچا کر شام' مصر یا ہندوستان فرار ہو گئے تھے۔ الموت کے اسماعیلیوں کا قتل عام ہوا اور اگرچہ روم کی نئی سلجوق حکومت نے منگولوں کی اطاعت تسلیم کر لی تھی تاہم وہ پھر کبھی پوری طرح اپنے قدموں پر کھڑی نہ ہو سکی۔ بیبرس وہ پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے منگولوں کا راستہ روکا۔ بیبرس ترک غلام فوجیوں کی قائم کردہ نئی مصری ریاست کا سلطان تھا۔ مملوکوں

(غلاموں) نے صلاح الدین کی قائم کردہ ایوبی سلطنت کی فوج پر غلبہ پا لیا تھا۔ 1250ء میں مملوک امیروں نے ایوبی ریاست کے خلاف کامیاب بغاوت کی اور مشرق قریب میں اپنی سلطنت قائم کردی۔ 1260ء میں بیبرس نے شمالی فلسطین میں عین جالوت میں منگولوں کو شکست سے دوچار کیا۔ اُدھر ہندوستان میں داخل ہو کر منگولوں نے دہلی میں سلطنت قائم کر لی تھی۔ انہوں نے چین کے منگول خان قبلائی خان کی اطاعت قبول کر لینے والی اسلامی سلطنت میں اپنی سلطنتیں قائم کر لی تھیں۔

منگولوں نے چار بڑی ریاستیں قائم کی تھیں۔ ہلاکو کی اولاد نے' جو ایل خان (خان اعظم کے نمائندگان) کہلاتی تھی' پہلے تو یہ حقیقت قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کو آخری شکست ہو چکی ہے۔ پھر انہوں نے وادیٔ فرات اور ایران کے پہاڑی علاقوں تک محدود اپنی سلطنت میں پسپا ہونے سے پہلے دمشق کو برباد کر دیا۔ چغتائی منگولوں نے دریائے جیحوں کے طاس میں ایک ریاست قائم کی جبکہ ''سفید اردو'' ☆ (یعنی تاتاری خانہ بدوش قبیلے) نے ارتش کے علاقے میں ریاست قائم اور ''سنہرا اردو'' دریائے والگا کے گرد حکومت کرنے لگا۔ یہ مشرقِ وسطیٰ میں ساتویں صدی میں عربوں کی یورشوں کے بعد سب سے بڑا سیاسی ابھار تھا' تاہم عرب مسلمانوں کے برعکس منگول اپنے ساتھ کوئی روحانیت نہیں لے کر آئے۔ اگرچہ ان کا اپنا رجحان بدھ مت کی طرف تھا تاہم وہ سب مذاہب کے حق میں رواداری سے کام لیتے تھے۔ ان کا قانونی ضابطہ یاسا' جو کہ چنگیز خان نے وضع کیا تھا' ایک عسکری نظام ہی تھا جو کہ شہریوں کے لیے مؤثر نہیں تھا۔ منگولوں کی پالیسی تھی کہ جب وہ کسی علاقے پر قبضہ کرتے تو اس کی مقامی روایات کو فروغ دیتے تھے۔ تیرہویں صدی کے اختتام اور چودھویں صدی کے آغاز تک چاروں منگول سلطنتوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح منگول سب سے عظیم اسلامی قوت بن گئے تاہم سرکاری طور پر اسلام کی قبولیت کے باوجود ان کی ریاستوں کا بنیادی نظریہ ''منگولیت'' (Mongolism) ہی تھا۔ جس کے تحت منگول اپنی شاہانہ اور عسکری قوت پر فخر کرتے تھے اور دنیا کی تسخیر کا خواب دیکھتے تھے۔ پوری ریاست کو عسکری خطوط پر چلایا جاتا تھا۔ بادشاہ ہی سپہ سالار ہوتا تھا اور اس سے امید کی جاتی تھی کہ وہ اپنی افواج کی کمان

☆ قارئین اس دلچسپ حقیقت سے یقیناً محظوظ ہوں گے کہ ان کی زبان کا نام یعنی ''اردو'' دراصل ترکی لفظ ہے۔ تاتاری بھی ترکی بولتے تھے اور ان کے ہاں لفظ ''اردو'' کا مطلب قبیلہ ہوتا تھا۔ یہی لفظ انگریزی میں HORDE بنا۔ (مترجم)

خود سنبھالے اور مہمات کی ذمہ داری اپنے نائبین کے شانوں پر نہیں ڈالے۔ اسی لیے ابتدائی زمانے میں ان کا کوئی دارالحکومت نہیں ہوتا تھا۔ جہاں بھی خان اور اس کی فوج خیمہ زن ہوتے وہی دارالحکومت ہوتا۔ ریاست کا پورا نظام کسی فوج کی طرح چلایا جاتا تھا اور انتظامیہ سپاہیوں کے ساتھ ساتھ گامزن رہتی تھی۔ اس خیمہ ثقافت کا انتظام زبردست اہلیت کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ان کے دو بڑے سیاسی مقاصد تھے یعنی دنیا پر قبضہ اور اقتدار کا دوام جو کہ ہر طرح کے ظلم و ستم کا جواز تھا۔ یہ نظریہ قدیم مطلقیت کے نظریے سے مشابہہ تھا' جس کے تحت اس بات پر یقین کیا جاتا تھا کہ جتنی زیادہ کسی حکمران کی قوت ہوگی اتنا ہی زیادہ ریاست کا امن اور سلامتی بہتر ہوں گے۔ کسی شاہی خاندان کے بادشاہوں کے فرمان اس وقت تک واجب العمل رہتے جب تک وہ خاندان تخت نشین رہتا۔ اس کے علاوہ دوسرے قانونی نظاموں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ حکومت میں تمام اعلیٰ عہدے خاندان کے افراد کو اور ان کی خوشامد کرنے والے مقامیوں کو دیئے جاتے تھے' جو حکومت کے مرکز میں عظیم خانہ بدوش فوج کے حاشیہ برداروں میں شامل ہو گئے تھے۔

اس کا اسلام کی مساوات پسندی سے تو بمشکل ہی موازنہ ہو سکتا ہے تاہم ایک حوالے سے اس کا موازنہ عباسی خلافت کے آخری برسوں میں معاشرے کے اندر وقوع پذیر ہونے والی عسکریت سے کیا جا سکتا ہے جس کے تحت امیر چھاؤنیوں میں بیٹھ کر حکومت کرتے تھے اور شہریوں اور علما کو ان کی اسلامی سرگرمیوں کے لیے آزادی دے دی گئی تھی۔ وہاں ہمیشہ یہ امکان رہا کرتا تھا کہ اگر کوئی امیر مستحکم ہو گیا تو فوج شہری معاملات میں زیادہ دخل انداز ہو سکتی ہے۔ منگول حکمرانوں کے تحت یہ دخل اندازی عمل میں آ گئی کیونکہ وہ اس قدر طاقتور تھے کہ علما پر نئی پابندیاں عائد کر سکتے تھے۔ شریعت کو بالادست ضابطے کے طور پر مزید برقرار رہنے نہیں دیا گیا۔ پندرہویں صدی تک یہ طے ہو چکا تھا کہ علما قوانین وضع کرنے کے لیے اجتہاد نہیں کر سکتے۔ اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ''اجتہاد کے دروازے'' بند ہو گئے۔ مسلمانوں کو ماضی کے فقہا کے فیصلے ماننے پر مائل کیا گیا۔ اصولی طور پر شریعت غیر متبدل قوانین کا نظام بن گئی جو مقتدر گھرانے کے شاہی قوانین کے لیے خطرہ نہیں بن سکتا تھا۔

اسلامی زندگی میں منگولوں کی مداخلت المناک تھی۔ منگول اپنے پیچھے شہروں اور کتب خانوں کے کھنڈر چھوڑ گئے تھے' معاشی تباہی اس پر مستزاد تھی۔ مگر جب منگولوں نے فتح حاصل کر لی تو پھر انہوں نے ان شہروں کو دوبارہ تعمیر کروایا جنہیں خود ہی بڑے پیمانے پر تباہ

کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پُرشکوہ دربار قائم کیے جنہوں نے سائنس، فن، تاریخ اور تصوف کو فروغ دیا۔ منگولوں کی سفاکی اور ظلم وستم اپنی جگہ تاہم وہ اپنی مسلمان رعایا سے بہت متاثر تھے۔ ان کے قائم کردہ سیاسی ڈھانچوں نے بعد کی اسلامی سلطنتوں پر اثر ڈالا۔ منگولوں کی قوت نے نئے آفاق کی خبر دی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ دنیا کو فتح کرنے ہی والے ہیں۔ وہ ایک نئی قسم کی استعماریت کے بانی تھے جو وسیع پیمانے پر تباہی وبربادی پھیلانے والے آفاقی اقتدار سے مربوط تھی۔ وہ مسلمانوں کے نظریات کو نیست ونابود کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے متاثر بھی ہوئے۔ مسلمان جس خوف و دہشت کی فضا میں جی رہے تھے اس کی وجہ سے ناامیدی کا شکار نہیں ہوئے تھے اور نہ منگول ریاستوں کو دیکھ کر اپنی سیاسی شکست پر دل گرفتہ ہوئے تھے۔ اسلام ایک مستحکم عقیدہ ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں تباہیوں کا مقابلہ مثبت انداز میں کیا ہے اور ان کو تعمیری طور پر استعمال کرتے ہوئے تازہ مذہبی بصیرتیں حاصل کی ہیں۔ ایسا ہی منگول یورش کے بعد ہوا جب لوگ واضح طور پر محسوس کر رہے تھے کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے تاہم ایک بالکل نیا عالمی نظام بھی ممکن تھا۔

اس حقیقت کا واضح مشاہدہ صوفی جلال الدین رومی (73-1207ء) کی بصیرت میں کیا جا سکتا ہے جو بذاتِ خود منگولوں کے ستم کا نشانہ بنے تھے، تاہم انہوں نے اپنی تعلیمات میں منگولوں کے ہمراہ آنے والے لامحدود امکانات کو بھی ظاہر کیا ہے۔ رومی خراسان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایک عالم اور صوفی تھے۔ رومی نے فقہ، الٰہیات، عربی اور فارسی ادب کا مطالعہ کیا۔ تاہم یلغار کرتے آ رہے منگول لشکر سے بچنے کے لیے ان کے خاندان کو فرار ہونا پڑا۔ وہ اناطولیہ میں سلطنتِ روم کے دارالحکومت قونیہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ رومی کی روحانیت سے خدا کے فراق اور کائناتی بے گھری کا احساس چھلک رہا تھا۔ رومی کہتا ہے کہ کسی انسان کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ وہ جبر کے کرب کو محسوس نہ کرے، جو کہ کسی بھی مرد یا عورت کو مذہبی جستجو پر آمادہ کر سکتا ہے۔ ہمیں اپنی محدودیت کا اور انا کے ایک سراب ہونے کا ادراک لازمی طور پر کرنا چاہیے۔ یہ ہماری انا ہے جو حقیقت اور ہمارے درمیان پردے ڈال دیتی ہے اور اگر ہم اپنی انا پرستی اور خودغرضی سے نجات پا لیں تو ہم دیکھیں گے کہ جو باقی رہ جائے گا وہی خدا ہوگا۔

رومی ایک ''وحدت الوجودی صوفی'' تھے۔ ان کی روحانی اور شخصی زندگی ایک جذباتی انتہا سے دوسری کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ انہوں نے رقص، گانے، شاعری اور موسیقی

میں سرور تلاش کیا۔ انہوں نے جس سلسلے کی بنیاد رکھی اسے ''رقصاں درویش'' کہا جاتا ہے۔ اس نام کا سبب ان کا اپنی جگہ کھڑے کھڑے گھومتے ہوئے رقص کرنا ہے جو ماورائیت کی ایک سحرانگیز کیفیت کا باعث بنتا ہے۔ اپنی واضح تلون مزاجی کے باوجود رومی اپنی زندگی ہی میں مولانا کے لقب سے مشہور ہوگئے تھے۔ ان کے مولویہ سلسلہ کا عظیم اثر آج بھی ترکی میں نمایاں ہے۔ ان کے فن کی شاہکار مثنوی کو صوفیوں کا صحیفہ کہا جاتا ہے۔ جہاں ابن العربی نے دانش وروں کے لیے لکھا تھا وہاں رومی نے تمام انسانوں کو اپنے آپ سے ماورا ہوکر جینے اور روزمرہ کی زندگی سے برتر زندگی بسر کرنے کا پیغام دیا۔ مثنوی صوفیانہ طرز زندگی کو اپنانے کی تلقین کرتی ہے جو ہر شخص کو کائنات اور انسان کے اندر جاری دائمی جنگ میں ناقابل تسخیر بنا سکتا ہے۔ منگولوں کی یورشوں نے ایک صوفیانہ تحریک کی راہیں کشادہ کیں جس نے لوگوں کو ان کی روح کی گہرائیوں تک اتر جانے والے المیے سے نمٹنے کا حوصلہ دیا جبکہ رومی اس تحریک کی سب سے زیادہ تابناک اور عظیم مثالی شخصیت تھے۔ اس زمانے میں شروع ہونے والے نئے صوفیانہ طریق انسانی زندگی کے لامحدود امکانات پر زور دیتے تھے۔ منگول جو کچھ دنیاوی سیاست میں حاصل کرنے کے بے حد قریب تھے صوفیا روحانی سطح پر اس کی معرفت حاصل کر سکتے تھے۔

دوسروں نے اس دور کے ابھاروں کا جواب بہت مختلف انداز سے دیا۔ منگولوں کی یورشوں کے نتیجے میں ہونے والی ہولناک تباہی و بربادی نے روایت پسندی میں شدت پیدا کردی جو کہ ہمیشہ زرعی معاشرے کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ جب وسائل محدود تھے تب اس قسم کی ایجاد پسندی کی حوصلہ افزائی کرنا ناممکن تھا جیسی آج ہم جدید مغرب میں دیکھ رہے ہیں۔ آج کے جدید مغرب میں ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم اپنے ماں باپ سے زیادہ علم رکھیں اور ہمارے بچے ہم سے بھی زیادہ آگے بڑھیں۔ ہمارے معاشرے سے پہلے کوئی معاشرہ اس پیمانے پر ہونے والی ایجادات کے نتیجے میں افراد کو دوبارہ تربیت دینے اور انفراسٹرکچر (زیریں ڈھانچے) کو ازسرنو تعمیر کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ زرعی زمانے کے یورپ سمیت جدید عہد سے پہلے کے تمام معاشروں میں تعلیم کا مقصد پہلے سے موجود علم کی تدریس اور فرد کی ایجاد پسندی اور تجسس کے سامنے رکاوٹ کھڑی کرنا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی وجہ سے ایک ایسی کمیونٹی کا استحکام مخدوش ہوسکتا تھا جو نئی بصیرتوں کو استعمال کرنے کے ذرائع نہیں رکھتی تھی۔ مثال کے طور پر مدرسوں میں طلبہ کو قدیم کتابیں زبانی

یاد کروائی جاتی تھیں جبکہ مخصوص درسی کتابوں کی لفظی تعلیم دی جاتی تھی۔ علما کے درمیان عوامی مناظروں سے حق اور باطل کی تمیز ختم ہوگئی تھی۔ پڑھائی کے سوال جواب والے انداز میں دو مختلف تصورات سے کسی امتزاجی تصور کا اخذ کیا جانا ممکن نہیں تھا۔ مدرسے انہی خیالات کی ترویج کرتے تھے جو ساری دنیا میں مسلمانوں کو متحد کرسکیں۔ وہ ایسے مخالفانہ نظریات پر پابندی لگا دیتے تھے جو کہ اختلافِ رائے کا سبب بن سکتے تھے اور لوگوں کو سیدھا راستہ چھوڑ کر اپنے اپنے راستے پر گامزن ہونے کی طرف مائل کرسکتے تھے۔

چودھویں صدی تک صرف شریعت کے مطالعہ اور اس پر عمل ہی کو سب طرح کے مسلمانوں یعنی سنی اور شیعہ، صوفی اور فیلسوف نے قبول کرلیا تھا۔ اس زمانے تک علما کا ایمان تھا کہ یہ قوانین اسلامی تاریخ کے آغاز ہی سے مروج تھے۔ اسی لیے جہاں رومی جیسے صوفیا نے نئے آفاق کے مشاہدے کا آغاز کیا تھا وہاں بہت سے علما کو یقین تھا کہ کبھی کوئی شے تبدیل نہیں ہوگی۔ سو وہ مطمئن تھے کہ اجتہاد کے دروازے بند ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ماضی کے اتنے بڑے علمی ذخیرہ کے ضیاع، کتابوں کی بربادی اور علما کے قتل عام کے بعد ضروری یہی ہے کہ زیادہ تبدیلیوں کی بجائے اس تباہ شدہ علمی ذخیرے کو ہی بحال کیا جائے۔ چونکہ منگولوں کا عسکری ضابطہ شہری زندگی کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھتا تھا اس لیے علما کا ایمان والوں کی زندگیوں پر اثر ورسوخ برقرار رہا جبکہ ان کا جھکاؤ روایت پرستی کی طرف تھا۔ جہاں رومی جیسے صوفیا کا ایمان تھا کہ تمام مذاہب درست ہیں وہاں چودھویں صدی تک علما نے قرآن کی اجتماعیت پسندی کو ایک سخت گیر فرقہ واریت میں تبدیل کردیا تھا اور وہ دوسری روایات کو ماضی کے غیر متعلقہ آثار تصور کرتے تھے۔ اب مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں میں غیر مسلموں کا داخلہ بند کردیا گیا تھا اور حضرت محمد ﷺ کے بارے میں توہین آمیز الفاظ ادا کرنا جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ اس میں کوئی حیرت نہیں ہے کہ منگولوں کی یورشوں کے المیے نے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا۔ اسی وجہ سے غیر ملکیوں کو نہ صرف مشکوک بلکہ منگولوں کی طرح سفاک بھی تصور کیا جانے لگا تھا۔

تاہم ایسے بھی علما موجود تھے جنہوں نے ''اجتہاد کے دروازوں'' کے بند ہونے کو قبول نہیں کیا۔ پوری اسلامی تاریخ کے دوران، بڑے سیاسی بحرانوں کے وقت...... خاص طور پر غیر ملکی تسلط کے زمانے میں ...... ایک ''مجدد'' نئی صورتحال سے نبردآزما ہونے کے لیے عقیدے کا احیا کرتا رہا تھا۔ یہ اصلاحات عموماً یکساں انداز سے روبہ عمل آتی تھیں۔ یہ

اصطلاحات روایت پسندانہ ہوتی تھیں کیونکہ وہ کوئی نیا حل تخلیق کرنے کی بجائے بنیادوں کی طرف واپس جانے کی کوشش کرتے تھے۔لیکن قرآن اور سنت والے بدعتوں سے پاک اسلام کی طرف واپسی کی خواہش میں ان مصلحین نے وسطی عہد کی پیش رفتوں کو مٹا ڈالا جو کہ مقدس تصور کی جانے لگی تھیں۔ وہ غیر ملکی اثرات کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اجنبی تصورات کی وجہ سے عقیدے کی پاکیزگی اور خالص پن برقرار نہیں رہا۔اس طرح کا مصلح (ریفارمر) اسلامی معاشرے کی خصوصیت بن گیا۔ ہمارے دور میں جن لوگوں کو ''بنیاد پرست مسلمان'' کہا جاتا ہے وہ پرانی طرز کے مجددوں سے مکمل مشابہت رکھتے ہیں۔

منگولوں کے بعد کی دنیا میں اس عہد کے عظیم مصلح امام احمد ابن تیمیہؒ (1328ء۔1263ء) تھے۔وہ دمشق کے ایک عالم تھے اور انہیں منگولوں کے ہاتھوں ہولناک اذیتوں سے گزرنا پڑا تھا۔ ابن تیمیہؒ کا تعلق حنبلی مسلک کو ماننے والے علما کے ایک خاندان سے تھا اور وہ شریعت کی اقدار کے دوبارہ نفاذ کے آرزومند تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اسلام قبول کر لینے کے باوجود منگول کافر اور مرتد تھے کیونکہ وہ شریعت کی بجائے یاسا (منگولوں کا قبائلی قانون) پر عمل کرتے تھے۔ایک سچے مصلح کے مانند انہوں نے رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے بعد ہونے والی اسلامی ترقیوں پر تنقید کرتے ہوئے انہیں غیر مستند قرار دیا۔ان میں شیعیت' تصوف اور فلسفہ شامل تھے۔تاہم وہ ایک مثبت لائحہ عمل کے بھی حامل تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس بدلے ہوئے زمانے میں شریعت کو مسلمانوں کے حقیقی حالات کے مطابق ڈھالنا ہوگا چاہے اس عمل میں صدیوں کے دوران تشکیل پانے والے فقہ کے بیشتر حصے سے نجات حاصل کرنی پڑے۔ چنانچہ یہ بہت ضروری ہے کہ قانون داں شریعت کی روح سے مطابقت رکھنے والے ایک قانونی حل کو وضع کریں۔حکومت (اسٹیبلشمنٹ) کے لیے ابن تیمیہؒ ایک خطرناک شخصیت تھے۔ممکن ہے کہ قرآن اور سنت کی بنیادی اقدار کی طرف ان کی واپسی نیز تصوف اور فلسفے کا انکار ایک ردعمل ہو' تاہم یہ رویہ انقلابی بھی تھا۔انہوں نے نصابی کتابوں سے چمٹے ہوئے روایت پرست علما پر سخت نکتہ چینی کی اور اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرنے پر شام کی مملوک حکومت پر تنقید کی۔انہی افکار کی وجہ سے ابن تیمیہؒ کو قید کر دیا گیا اور چونکہ ان کو تصنیف و تالیف سے روک دیا گیا تھا اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اسی غم میں انتقال کر گئے۔دمشق کے عام لوگ ان سے محبت کرتے تھے کیونکہ وہ دیکھ سکتے تھے کہ ان کی شرعی اصلاحات لبرل ہیں اور یہ کہ وہ دل سے عوام کا مفاد چاہتے ہیں۔جب ان کا جنازہ اٹھا تو

ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس میں شریک ہوئے' جو کہ ان کی عوامی مقبولیت کا آئینہ دار ہے۔

تبدیلی وقوع پذیر ہوسکتی تھی تاہم وہ پریشان کن بھی ہوتی۔ تیونس میں عبدالرحمٰن ابن خلدون (1406ء ۔ 1332ء) نے ''مغرب'' یعنی اسلامی دنیا کے مغربی حصے میں یکے بعد دیگرے حکومتوں کو ناکام ہوتے ہوئے دیکھا۔ طاعون کی وبا نے گھروں کے گھر اجاڑ کردیئے۔ مصر سے خانہ بدوش قبیلے شمالی افریقہ نقل مکانی کرآئے تھے' جن کی وجہ سے وسیع پیمانے پر بربادی پھیلی اور بربر معاشرے میں زوال نمودار ہوا۔ خود ابن خلدون سپین سے نقل مکانی کرکے تیونس آئے تھے جہاں عیسائیوں نے مسلمان علاقوں کو دوبارہ فتح کرلیا تھا۔ انہوں نے 1236ء میں قرطبہ اور 1248ء میں اشبیلیہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ اندلس کی اسلامی سلطنت صرف غرناطہ کی شہری ریاست تک ہی رہ گئی تھی اور اس پر بھی 1249ء میں عیسائیوں نے قبضہ کرلیا' تاہم اس سے پہلے چودھویں صدی کے وسط تک الحمرا کا عظیم الشان محل تعمیر ہوچکا تھا۔ اسلام واضح طور پر بحران کی زد میں تھا۔ ابن خلدون نے اس صورتحال پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا: ''جب حالات مکمل طور پر تبدیلی سے دوچار ہوتے ہیں تو یہ عمل ایسا ہوتا ہے گویا ساری مخلوقات تبدیل ہورہی ہوں اور ساری دنیا کی قلبِ ماہیئت ہورہی ہو' گویا نئے سرے سے تخلیق کیا جارہا ہو' دنیا کو نئے سرے سے وجود میں لایا جارہا ہو۔'' [3]

ابن خلدون اس تبدیلی کی وجوہات کو دریافت کرنے کے آرزومند تھے۔ وہ آخری عظیم ہسپانوی فیلسوف تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فلسفیانہ عقلیت پسندی کے اصولوں کا اطلاق تاریخ کے مطالعے پر کیا' جس کو اب تک فلسفیوں کے معیار سے کم تر سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہ ابدی سچائیوں کی بجائے صرف لمحاتی اور عارضی واقعات سے ہی سروکار رکھتی تھی لیکن ابن خلدون کو یقین تھا کہ تاریخی واقعات کے بہاؤ کے پیچھے آفاقی قوانین معاشروں کی تقدیروں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ''عصبیت'' کا مضبوط شعور ہوتا ہے جو لوگوں کو بقا کے اور اگر حالات موزوں ہوں تو دوسرے لوگوں کو محکوم کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اس فتح کا مطلب ہوتا ہے کہ غلبہ پانے والے گروہ محکوم لوگوں کے وسائل کو حاصل کرسکتے ہیں' نیز ایک ثقافت اور ایک پیچیدہ شہری زندگی کو تشکیل دے سکتے ہیں۔ لیکن جونہی مقتدر طبقہ ایک عیاشانہ طرز زندگی کا عادی ہوجاتا ہے' آسودہ خاطری پیدا ہوجاتی ہے اور وہ قوت کھونے لگتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا کا اطمینان بخش انداز میں خیال نہیں رکھ پاتے۔ حسد و رقابت جنم لیتے ہیں۔ معیشت میں زوال آنا شروع ہوجاتا ہے۔ اس طرح ریاست کسی ایسے

نئے قبیلے یا خانہ بدوش گروہ کا آسان شکار بن جاتی ہے جو کہ اپنی عصبیت کے پہلے دور میں ہوتا ہے اور اس کے بعد سارا عمل دہرایا جاتا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی شاہکار کتاب ''المقدمہ'' میں اس نظریے کا اطلاق اسلام کی تاریخ پر کیا ہے اور ان کے بعد آنے والے مسلمان سلطنت سازوں نے اس کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے مغربی تاریخ دانوں نے بھی اس کتاب سے خوب استفادہ کیا جو ابن خلدون کو تاریخ کے سائنسی مطالعے کا بانی کہتے ہیں۔

ابن خلدون نے چودھویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں منگول ریاستوں کے زوال کا مشاہدہ کیا' جس سے ان کے نظریے کی واضح طور پر تصدیق ہوگئی۔ ان کی حقیقی عصبیت عروج کو پہنچی' آسودہ خاطری پیدا ہوئی اور اب دوسرے غالب گروہوں کے قبضہ کرنے کے لیے فضا تیار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ نئے قائدین اسلامی سرزمین کے مرکز سے نہیں بلکہ اسلامی دنیا کے ایسے دور دراز گوشوں سے آئیں گے جو منگول حکومت کے تحت نہیں رہے ہیں۔ اس وقت تک مصر اور شام میں مملوک سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ مملوکوں نے اپنے عروج پر پہنچ کر ایک جاندار معاشرہ' ایک قاہرانہ فوج اور ایک نشوونما پاتی ہوئی ثقافت تشکیل دی تھی۔ لیکن پندرہویں صدی تک سلطنت کسی بھی زرعی ریاست کی طرح اپنے وسائل سے ہاتھ دھو چکی تھی اور ٹوٹنا شروع ہوگئی تھی۔

اس عہد کی روح کا بھرپور اظہار جس حکمران نے کیا وہ تیمور لنگ (1405ء۔1336ء) تھا۔ وہ ثمرقند میں منگول چغتائی ریاست میں پلا بڑھا تھا اور منگول آدرش کے حوالے سے بڑا جذباتی تھا۔ اسے مغرب میں ٹیمبرلین (Tamburlain) کہا جاتا ہے۔ اس نے زوال پذیر چغتائی سلطنت میں اقتدار پر قبضہ کیا' منگول نسل سے تعلق کا دعویٰ کیا اور منگولوں کی فطری وحشت و سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے منگول علاقوں کو دوبارہ فتح کرنا شروع کیا۔ تیمور نے اپنی حاصل کرنے کی زبردست خواہش اور تباہی و بربادی کی پسندیدگی کو اسلام کے لیے ایک جذبے کے ساتھ باہم ملایا اور چونکہ اس نے اپنے عہد کے جوش و ولولے کو اپنا لیا تھا اس لیے وہ ایک عوامی سورما بن گیا۔ اس نے ثمرقند میں عالی شان عمارات تعمیر کروائیں جہاں وہ ایک پُرشکوہ دربار میں جلوہ آرا ہوتا تھا۔ اس کا اسلام کا تصور — متعصب' سفاک اور متشدد — علماء کے روایت پسندانہ ایمان اور صوفیاء کے محبت کے فلسفے سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کا جلاد تصور کرتا تھا جسے مسلمان امیروں کو ان کی غیر منصفانہ کارروائیوں پر سزا

دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس کو واحد فکر اس بات کی تھی کہ نظم و ضبط قائم کیا جائے اور بدعنوانوں کو سزا دی جائے۔ اگرچہ اس کی رعایا اس کی سفاکی سے لرزہ براندام رہتی تھی تاہم لوگ حالیہ برسوں کے انتشار کے بعد اس کی مضبوط حکومت کی تعریفیں کرتے تھے۔ اپنے سے پہلے والے منگولوں کی طرح تیمور بھی نہ روکا جاسکنے والا دکھائی دیتا تھا اور ایک وقت تو ایسا آیا جب لگتا تھا کہ وہ ساری دنیا کو فتح کرلے گا۔ 1387ء تک وہ سارے ایران اور عراق پر قبضہ کرچکا تھا۔ 1375ء میں اس نے روس میں قدیم ''سنہری اردو'' کو فتح کرلیا اور 1398ء میں وہ ہندوستان پر غالب آ گیا جہاں اس نے ہزاروں ہندو قیدیوں کا قتل عام کیا اور دہلی کو تاخت و تاراج کردیا۔ دو سال بعد اس نے اناطولیہ اور دمشق کو فتح کرلیا اور بغداد میں خون کی ندیاں بہادیں۔ 1404ء میں اس نے چین پر حملہ کیا جہاں اگلے سال وہ قتل کردیا گیا۔

کوئی بھی تیمور کی سلطنت کو متحد نہیں رکھ سکا۔ دنیا کی تسخیر اب بھی واضح طور پر ایک ناممکن خواب تھی تاہم پندرہویں صدی کے دوران میں بارودی ہتھیاروں کی ایجاد نے نئے مسلمان حکمرانوں کو پندرہویں صدی کے اواخر اور سولہویں صدی کے آغاز میں دیرپا اور قابل انتظام سلطنتیں قائم کرنے کا اہل بنا دیا' جنہوں نے منگول آدرش کو اسلام سے باہم ملانے کی بھی کوشش کی۔ وہ نئی سلطنتیں ہندوستان' آذربائیجان اور اناطولیہ میں قائم ہوئیں۔

سلطنتِ دہلی تیرہویں صدی کے دوران قائم ہوچکی تھی اور چودھویں صدی کی ابتدا تک اسلام بنگال کے ساتھ ساتھ دریائے گنگا کے طاس میں خوب اچھی طرح پاؤں جما چکا تھا۔ ہندوستان کے مقتدر طبقے سے تعلق رکھنے والے ہندو راجپوتوں نے' جو کہ پہاڑی علاقوں میں آباد تھے' اپنی خودمختاری کو قائم رکھا تاہم ہندوؤں کی اکثریت نے مسلمانوں کی برتری کو تسلیم کرلیا۔ یہ امر اتنا حیران کن نہیں ہے جتنا کہ بظاہر لگتا ہے۔ ذات پات کے نظام کی وجہ سے سیاسی اقتدار چند ہی گھرانوں تک محدود تھا' اور جب وہ گھرانے طاقت کھو بیٹھتے تو ہندو ان کی جگہ کسی کو بھی قبول کرنے پر راضی ہوتے تھے بشرطیکہ وہ ذات پات کے نظام میں کمی بیشی نہ کریں۔ پردیسی (Outsiders) ہونے کی وجہ سے مسلمان ان پابندیوں سے آزاد تھے نیز ان کے پیچھے ایک طاقت ور بین الاقوامی معاشرہ بھی تھا۔ ہندوستان میں مسلمان ایک اقلیت ہی رہے۔ ''شودروں'' سمیت نچلی ذاتوں اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے صوفی پیروں کی تبلیغ کے نتیجے میں اسلام قبول کیا تھا تاہم اکثریت اپنے ہندو' بدھ یا جین عقائد پر ہی قائم رہی۔ جیسا کہ اکثر الزام لگایا جاتا ہے

یہ بات درست نہیں ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں بدھ مت کو برباد کر دیا تھا۔ صرف ایک معبد پر ایک مرتبہ حملہ کرنے کے شواہد ملتے ہیں جبکہ وسیع پیمانے پر قتل عام کی تائید میں کوئی ٹھوس ثبوت دستیاب نہیں ہیں۔ 1330ء تک برصغیر کے بیشتر حصوں نے سلطنتِ دہلی کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا' تاہم سلطنت کے مختلف حصوں میں غیر دانش مندانہ حکمرانی کی وجہ سے مسلمان امیروں نے بغاوت کر دی اور یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ سلطنت اتنی بڑی ہے کہ ایک آدمی اس پر حکومت نہیں کر سکتا۔ عمومی معمول کے مطابق مرکزی اختیارات مختلف امیروں میں بٹ گئے تھے اور وہ اس کی مدد سے اپنی اپنی ریاستوں پر حکومت کرتے تھے۔ بارود کی ایجاد تک سلطنتِ دہلی مسلمان ہندوستان (مسلم انڈیا) میں بہت سی طاقتوں میں سے ایک طاقت رہی۔

منگول ریاستوں کے کناروں پر غازی جنگجوؤں کو ان کی اپنی امارتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی تاہم وہ منگول حکمرانوں کو آقا تسلیم کرتے تھے۔ وہ غازی ریاستیں عمومی طور پر مذہبی تھیں اور تصوف کا مضبوط رجحان رکھتی تھیں۔ آذربائیجان اور اناطولیہ میں مختلف صوفیانہ طریقوں نے شیعیت کی انقلابی روح کو اختیار کر لیا تھا۔ انہوں نے ابتدائی دور کے شیعوں کو متاثر کرنے والے انتہاپسندانہ فلسفے ''غلو'' کا احیاء کیا جس کے تحت حضرت علیؓ کو الوہی ہستی کی تجسیم تصور کیا جاتا تھا اور یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ان کے جو امیر فوت ہو گئے تھے وہ ''غیبت'' میں چلے گئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے قائدین کو مہدی قرار دیتے تھے جو عدل کے ایک نئے عہد کی شروعات کرنے کے لیے واپس آئے تھے۔ اناطولیہ میں بیکتاشی درویشوں کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ ایک نئے نظام کا پرچار کرتے تھے جو قدیم مذہبی اصولوں کو مٹا دے گا۔ آذربائیجان کا صفویہ سلسلہ بھی اس کے مماثل تھا جو ایک سنی طریق کے طور پر شروع ہوا تھا مگر جو پندرہویں صدی تک غلو کے تصورات سے متاثر ہو گیا اور اس کے پیروکار خود کو بارہ امامی شیعہ کہلوانے لگے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ ان کا قائد ساتویں امام کی اولاد تھا لہٰذا مسلم امہ کا واحد جائز رہنما تھا۔ سولہویں صدی کے آغاز تک اس سلسلے کے پیر اسماعیل نے' جو کہ خود کو امام غائب قرار دیتا تھا' ایران میں ایک شیعہ سلطنت قائم کی۔

جب منگول ریاستیں منہدم ہوئیں تو پورے کا پورا اناطولیہ چھوٹی چھوٹی آزاد غازی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا' جنہوں نے تیرہویں صدی کے اواخر سے زوال پذیر بازنطینی سلطنت کے قصبوں اور بستیوں کو چھیننا شروع کر دیا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں سے ایک پر

عثمانی خاندان حکومت کرتا تھا جو 14 ویں صدی کے ابتدائی برسوں کے دوران رفتہ رفتہ طاقتور ہوتا چلا گیا۔ 1326ء میں عثمانیوں نے برصہ کو فتح کر لیا اور اسے اپنا دارالخلافہ بنا لیا۔ 1329ء میں انہوں نے ازنیک کو فتح کر لیا اور 1372ء تک وہ بازنطین کے کافی بڑے حصے پر قبضہ کر چکے تھے۔ انہوں نے ایڈرین (ایڈریانوپل) کو اپنا دارالحکومت بنایا اور بازنطینی بادشاہ کو اپنا باج گزار اتحادی بنا لیا۔ عثمانیوں کی کامیابی کا راز ان کی انتہائی منظم اور تربیت یافتہ ''نئی فوج'' (ینی چری) تھی، جو کہ غلاموں پر مشتمل تھی۔ مغربی مسلمان حکمرانوں میں مراد اوّل (89-1360ء) سب سے زیادہ طاقتور حکمران بن گیا تھا اور 1372ء میں جزیرہ نما بلقان کی سب سے اہم طاقت بلغار اور سربیا کی آزاد بادشاہتوں پر حملے کرتے ہوئے وہ بلقان میں پیش رفت کے لیے تیار تھا۔ 1389ء میں عثمانیوں نے وسطی سربیا میں کوسوو کے میدان میں سرب فوج کو شکست دی۔ مراد ہلاک ہو گیا تاہم سرب شہزادے ہرلبلجا نووچ لازار کو گرفتار کر کے سزائے موت دے دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی سرب آزادی کا خاتمہ ہو گیا اور سرب آج بھی پرنس لازار کو ایک شہید اور قومی ہیرو مان کر اس کا احترام اور اسلام سے نفرت کرتے ہیں۔ عثمانیوں کی پیش قدمی جاری رہی اور بازنطینی رعایا کی اکثریت میں وہ نامقبول ہوتے رہے۔ پرانی سلطنت بدنظمی کا شکار تھی۔ عثمانیوں نے نظم و ضبط قائم کیا اور معیشت کو بحال کیا جس کے نتیجے میں کافی تعداد میں لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔

1402ء میں عثمانیوں کو اس وقت ایک بڑی ناکامی سے دوچار ہونا پڑا جب تیمور نے ان کی فوج کو انگورا میں شکست دی تاہم تیمور کی وفات کے بعد انہوں نے دوبارہ اپنی قوت مجتمع کر لی اور 1453ء میں محمد دوم (81-1451ء) نے نئے بارودی ہتھیار استعمال کر کے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔

بازنطینی سلطنت نے، جسے مسلمان ''روم'' کہا کرتے تھے، صدیوں تک اسلام کو پیش قدمی نہیں کرنے دی۔ یکے بعد دیگرے خلفاء کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اب محمد فاتح نے اس پرانے خواب کو تعبیر کا جامہ پہنا دیا تھا۔ مسلمان ایک نئے عہد کے آغاز پر تھے۔ وہ منگول خطرے سے بچ نکلے تھے اور نئی قوت حاصل کر چکے تھے۔ پندرہویں صدی کے اختتام تک اسلامی سلطنت دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور بلاک بن چکی تھی۔ مسلمان مشرقی یورپ، یوریشیائی میدانوں اور ذیلی صحارائی افریقہ میں اپنے تاجروں کے مفاد کے لیے داخل ہو گئے

تھے۔ تیرہویں صدی میں مسلمان تاجر بھی مشرقی افریقہ میں بحرجنوبی کے ساحل کے ساتھ ساتھ' جنوبی عرب اور برصغیر ہندوستان کے مغربی ساحلوں کے ساتھ ساتھ اپنے کاروبار مستحکم کر چکے تھے۔ جب ملائیشیا میں بدھ مت کے ماننے والوں کی تجارت کو زوال آ گیا تو مسلمان تاجروں نے' جن میں سے ہر ایک مذہبی مبلغ بھی تھا' وہاں کاروبار جما لیے اور جلد ہی عزت و احترام حاصل کرلیا۔ صوفی مبلغین کاروباری لوگوں کے نقش قدم پر چل کر وہاں پہنچے اور چودھویں اور پندرہویں صدی تک ملائیشیا میں اسلام چھا چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری دنیا مسلمان ہورہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو اسلامی حکومت کے تحت نہیں تھے جب اپنے ملکوں سے روانہ ہوتے تو چونکہ تمام اہم بندرگاہوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا' اس لیے انہیں وہاں اسلام کا سامنا ہوتا۔ یہاں تک کہ جب پندرہویں صدی کے اواخر اور سولہویں صدی کے اوائل میں یورپی جہازراں حیرتناک دریافتیں کررہے تھے تب بھی وہ بحری گزرگاہوں سے مسلمانوں کو نہیں ہٹا سکے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسلام ناگزیر ہے اور اب مسلمان نئی سلطنتیں قائم کرنے کے لیے تیار تھے جنہوں نے دنیا میں بہت زیادہ طاقت ور اور جدید بن جانا تھا۔

✿ ✿ ✿ ✿

حصہ چہارم

فاتح اسلام

شاہانہ اسلام

(1500ء۔1700ء)

بارود کی دریافت اور اس کے استعمال کی وجہ سے ایک ایسی عسکری ٹیکنالوجی وجود میں آئی جس نے حکمرانوں کو اپنی رعایا پر پہلے سے کہیں زیادہ طاقت دے دی۔ وہ بہت بڑے علاقوں پر مؤثر انداز میں گرفت رکھ سکتے تھے بشرطیکہ انہوں نے ایک اہل انتظامیہ کو بھی تشکیل دے دیا ہو۔ عسکری ریاست' جو کہ عباسی قوت کے زوال کے بعد سے اسلامی سیاست کی ایک خصوصیت رہی تھی' اب مزید طاقت ور ہو سکتی تھی۔ یورپ میں بھی بادشاہوں نے فعال حکومتی مشینری کے ساتھ بڑی مرکزی ریاستیں اور مطلق بادشاہتیں قائم کرنا شروع کر دیں۔ پندرہویں صدی کے اواخر اور سولہویں صدی کے اوائل میں تین بڑی اسلامی سلطنتیں قائم کی گئی تھیں۔ ایران میں صفوی سلطنت' ہندوستان میں مغل سلطنت اور اناطولیہ' شام' شمالی افریقہ اور عرب میں عثمانی سلطنت۔ ازبکستان میں دریائے جیحوں کے طاس میں ایک بڑی اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ مراکش میں شیعہ رجحانات کی حامل ایک اور بڑی اسلامی ریاست قائم ہوئی جبکہ اس وقت مسلمان تاجروں کا مقابلہ چینی' جاپانی' ہندو اور بدھ تاجروں کے ساتھ تھا۔ تاہم سولہویں صدی میں مسلمان سب سے اوپر آ چکے تھے۔

چنانچہ وہ فتح کا زمانہ تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ تینوں ہی سلطنتوں نے اسلام کی مساویانہ روایات سے منہ موڑ لیا تھا اور مطلق بادشاہتیں قائم کر لی تھیں۔ سرکاری زندگی کا ہر شعبہ باقاعدہ نظام اور بیوروکریٹک نفاست کے ساتھ چلایا جاتا تھا اور ان سلطنتوں میں ایک بھرپور انتظامی ڈھانچہ وجود میں آ چکا تھا۔

وہ سب سلطنتیں منگولوں کے عسکری ریاست کے تصور سے بہت متاثر تھیں تاہم

شاہی پالیسیوں میں شہریوں کو بھی شامل کیا جاتا تھا تاکہ شاہی خاندانوں کو زیادہ سے زیادہ عوامی تائید حاصل ہو جائے۔ لیکن ایک نہایت اہم رُخ سے یہ سلطنتیں عباسی ریاست سے مختلف تھیں۔ عباسی خلفا اور ان کے درباریوں نے کوئی اسلامی ادارہ قائم نہیں کیا تھا۔ وہ شریعت کے قوانین کی پابندی نہیں کرتے تھے اور انہوں نے اپنے ہی دنیادارانہ ضابطے گھڑ لیے ہوئے تھے۔ جبکہ تمام نئی سلطنتیں مضبوط اسلامی بنیاد رکھتی تھیں۔ خود حکمران اسلام کی ترویج اور فروغ کے لیے سرگرم تھے۔ صفوی ایران میں شیعیت ریاست کا مذہب بن گئی تھی۔ مغل پالیسی پر فلسفے اور تصوف کے غالب اثرات تھے۔ عثمانی سلطنت کاملاً شرعی خطوط پر چلائی جاتی تھی۔

مگر پرانے مسائل اب بھی موجود تھے۔ کوئی حکمران کتنا ہی دین دار کیوں نہ ہوتا اس انداز کی بادشاہت قرآن کی روح کے برخلاف تھی۔ لوگوں کی اکثریت اب بھی غربت و افلاس میں زندگی بسر کر رہی تھی اور لوگ زرعی معاشرے کی مخصوص لعنت یعنی ناانصافیوں کا شکار تھے۔ اس کے علاوہ نئی نئی دشواریاں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔ مغل ہندوستان ہو یا عثمانی سلطنت کا مرکز اناطولیہ دونوں جگہوں پر مسلمان نووارد تھے۔ مسلمانوں کو دونوں مقامات پر غیر مسلم اکثریت کے ساتھ تعلق استوار کرنے کا موزوں طریقہ سیکھنا تھا۔ ایک شیعہ سلطنت کے قیام سے شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک نئی فیصلہ کن تقسیم واقع ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں ایک ایسی عدم برداشت اور جارحانہ فرقہ واریت نے جنم لیا جس کی اسلامی دنیا میں پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ فرقہ وارانہ تقسیم عین اسی زمانے میں یورپ میں کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں میں نمودار ہونے والے تلخ تنازعے کے مماثل تھی۔ اس کے علاوہ خود یورپ بھی مسلمانوں کے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا جو اب تک ایک پسماندہ علاقہ رہا تھا اور اسی لیے مسلمانوں کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی تاہم اس زمانے میں یورپ نے ایک مکمل طور پر نئی تہذیب کو تشکیل دینا شروع کر دیا تھا جو کہ زرعی معاشرے کی جکڑبندیوں سے آزاد تھی۔ اسی تہذیب کی بدولت یورپ اسلامی دنیا سے نہ صرف برتر ہو گیا بلکہ اس نے اسے اپنا محکوم بھی بنا لیا۔ نیا یورپ اپنی طاقت کو مجتمع کرنا تو شروع ہو گیا تھا تاہم سولہویں صدی تک وہ کوئی حقیقی خطرہ نہیں بن پایا تھا۔ جب روسیوں نے مسلمانوں کے زیر قبضہ قازان اور استراخان پر حملہ کیا (56-1552ء) اور

وہاں عیسائیت کو رواج دیا تو مسلمانوں کو اس شکست کے شر میں خیر کا جو پہلو دستیاب ہوا وہ یہ تھا کہ شمالی یورپ کے ساتھ ان کے تجارتی رابطوں کا آغاز ہوگیا۔ آئبیریائی جہاز راں، جنہوں نے 1492ء میں امریکہ کو دریافت کرلیا تھا اور دنیا کے گرد نئے تجارتی بحری راستے کھولے تھے، پرتگیز تاجروں کو نقل و حرکت میں اضافی سہولت فراہم کر چکے تھے۔ سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں انہوں نے بحیرۂ احمر میں ایک نئی صلیبی جنگ (Neo-Crusade) کا آغاز کرتے ہوئے جنوبی سمندروں میں مسلمانوں کی تجارت کو برباد کرنے کی کوشش کی۔ مغرب کے لیے پرتگیزوں کی ان مہمات کی بڑی اہمیت تھی تاہم اسلامی دنیا پر ان کے بہت تھوڑے اثرات پڑے۔ مسلمانوں کو ایران میں شیعہ سلطنت کے قیام میں کہیں زیادہ دلچسپی تھی۔ اولین دور کے صفویوں کی شاندار کامیابیوں نے سنی مسلمانوں کی توقعات کو شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ صدیوں بعد پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ ایک طاقتور شیعہ سلطنت اسلام کے قلب میں قائم ہوگئی تھی۔

✿ ✿ ✿ ✿

صفوی سلطنت

آذربائیجان کے صفوی صوفیانہ سلسلے کے لوگ بارہ امامی شیعیت کو اپنا چکے تھے۔ وہ جارجیا اور کاکیشیا کے عیسائیوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ عراق اور مغربی ایران کے امیروں کا غصہ و عداوت بھی مول لے چکے تھے۔ 1500ء میں ساٹھ سالہ اسمٰعیل اس سلسلے کا گدی نشین بنا اور اُس نے امیروں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے اپنے باپ کے انتقام کے لیے کارروائیوں کا آغاز کیا۔ 1501ء میں اسمٰعیل نے تبریز کو فتح کرلیا اور پھر اگلے دس برسوں کے دوران باقی ماندہ ایران کو بھی فتح کرلیا۔ اس نے اعلان کیا کہ بارہ امامی شیعیت اس کی قائم کردہ نئی سلطنت کا سرکاری مذہب ہوگی۔

یہ ایک چونکا دینے والا واقعہ تھا۔ اس زمانے تک بیشتر شیعہ نسلاً عرب تھے۔ ایران میں رےؔ کاشان اور خراسان جیسے شیعہ مراکز موجود تھے۔ اس کے علاوہ قم کی قدیم چھاؤنی بھی تھی۔ تاہم ایرانیوں کی اکثریت سنی تھی۔ اسمٰعیل نے ایران سے سنی مسلک کو مٹا دیا۔ تصوف کے ماننے والوں پر جبر واستبداد کیا گیا اور علماء کو یا تو سزائے موت دے دی گئی یا وطن بدر کردیا گیا۔ اس سے پہلے کسی بھی شیعہ حکمران نے اس پیمانے پر کچھ کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی۔ جدید ہتھیاروں نے مذہبی حکومت کو ایک نئی جابرانہ و متشددانہ قوت دے دی تھی۔ پچھلے دو سو برسوں کے دوران شیعوں اور دیگر مسلمانوں کے مابین مصالحت قائم رہی تھی۔ صدیوں سے شیعیت ایک باطنی اور متصوفانہ فرقے کے طور پر چلی آرہی تھی جو کہ سیاست سے دور رہتا تھا اور جس کا ایمان تھا کہ امام غائب کی عدم موجودگی میں کوئی بھی حکومت جائز نہیں ہوسکتی۔ ایسی صورتحال میں ایک ''شیعہ ریاست'' کیوں کر وجود میں آسکتی تھی؟ تاہم شاہ اسمٰعیل اس منطق کا قائل نہیں تھا۔ ممکنہ طور پر اسے بارہ اماموں کو ماننے والے شیعوں کی روایات کا پوری طرح علم

نہیں تھا۔ وہ شیعیت کے انتہا پسندانہ رُخ غلو کا ماننے والا تھا' جس کے ماننے والوں کا ایمان تھا کہ مثالی ریاست قائم ہونے ہی والی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اپنے پیروکاروں سے کہا ہو کہ وہ ہی امام غائب ہے اور وہ آخری زمانے کی جنگیں لڑنے کے لیے آیا ہے۔ سنی اسلامی دنیا کے خلاف اس کا جہاد ایران میں ہی اختتام پذیر نہیں ہوا۔ 1510ء میں اس نے خراسان سے سنی ازبکوں کو بے دخل کر دیا اور انہیں دریائے جیحوں کے شمال میں دھکیل دیا۔ اس نے سنی عثمانیوں پر بھی حملہ کیا تاہم سلطان سلیم اول نے 1514ء میں اُسے کالدیران کی جنگ میں شکست دی۔ اپنے علاقوں سے باہر سنت کو کالعدم کرنے کی اس کی کوشش تو ناکامی سے دوچار ہوگئی تاہم ایران کے اندر اسمٰعیل کی جارحیت کامیاب رہی۔ سترہویں صدی کے اواخر تک ایرانیوں کی اکثریت شیعہ ہو چکی تھی اور آج تک شیعہ ہے۔

شاہ اسمٰعیل نے ایک عسکری ریاست قائم کی تھی تاہم وہ انتظامیہ میں شامل غیر فوجی لوگوں (سویلین) پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا' پرانے ساسانی اور عباسی بادشاہوں کی طرح شاہ کو "ظلِ الٰہ" کہا جاتا تھا تاہم اسمٰعیل نے اپنے آپ کو اماموں کی نسل سے قرار دے کر قانونی جواز حاصل کیا تھا۔ صفویوں کو اس حقیقت کا ادراک کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ اختلاف کے زمانے میں جس انقلابی جوش و جذبے کو جس انتہا پسندانہ نظریے نے بھڑکایا تھا وہ حکومت کے قیام کے بعد زیادہ کارآمد نہیں رہا۔ چنانچہ شاہ عباس اول (1629ء۔ 1588ء) نے غلو کا نظریہ رکھنے والی افسر شاہی سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اُس نے عرب شیعہ علما کو بیرونی ممالک سے بلایا تاکہ وہ عوام کو زیادہ روایت پسندانہ بارہ امامی شیعیت کی تعلیم دیں۔ اس نے ان علما کے لیے مدرسے قائم کیے اور انہیں دل کھول کر مالی وسائل فراہم کیے۔ عباس کی حکمرانی میں سلطنت اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس نے صفویوں کے لیے اہم علاقائی فتوحات حاصل کیں اور اس کے دارالحکومت اصفہان میں ایک ثقافتی نشاۃ ثانیہ رونما ہوئی' جو یورپ میں حالیہ اطالوی نشاۃ ثانیہ کے مماثل تھی۔ اس نشاۃ ثانیہ نے علاقے کے مشرکانہ ماضی یعنی اسلام سے پہلے کی فارسی ثقافت سے اثر قبول کیا تھا۔ وہ زمانہ بہزاد (وفات 1535ء) اور رضائے عباری (وفات 1635ء) جیسے صفوی مصوروں کا تھا' جنہوں نے تابناک اور خوابوں جیسے منی ایچر (نقشِ کوچک) تخلیق کیے۔ اصفہان شاندار مدرسوں' مسجدوں' باغات' محلات اور بڑے بڑے کشادہ چوکوں والا شہر بن گیا۔

تاہم نقل مکانی کر کے آنے والے نئے علما ایک انوکھی صورتحال سے دوچار تھے۔

اس سے پہلے ایک غیر حکومتی گروہ ہونے کی وجہ سے ان کے پاس اپنے شیعہ مدرسے نہیں تھے اور وہ مطالعہ اور تبادلہ خیالات کے لیے ایک دوسرے کے گھروں ہی میں اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اصولوں کی بنیاد پر حکومت سے الگ تھلگ رہے تھے مگر اب ان سے تقاضا کیا جا رہا تھا کہ وہ ایران کے تعلیمی اور قانونی نظام کو سنبھالیں۔ اس کے علاوہ حکومت کے زیادہ مذہبی کاموں کو بھی انجام دیں۔ شاہ نے انہیں دل کھول کر تحائف اور امداد دی جس کے نتیجے میں بالآخر وہ مالی طور پر خود مختار ہو گئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے عقیدے کی ترویج کے اس منفرد موقعے کو مسترد نہیں کر سکتے تاہم وہ اب بھی ریاست سے محتاط ہی رہے اور حکومتی عہدوں کو نظر انداز کر کے رعایا ہی بنے رہنے کو ترجیح دیتے رہے۔ ان کی حیثیت بہت طاقتور تھی۔ بارہ امامی روایتی شیعیت کے مطابق امام غائب کے جائز نمائندگان شاہ نہیں بلکہ علما تھے۔ پھر بھی اب تک صفوی ان کے ساتھ ہم آہنگی برقرار رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ وہ اس وقت تک ان کی حیثیت سے مکمل طور پر استفادہ کے قابل نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ سارے کے سارے ایرانی عوام شیعہ نہیں ہو جاتے۔ تاہم ان کی نئی قوت کا مطلب تھا کہ بارہ امامی شیعیت کے کچھ زیادہ کشش انگیز امتیازی وصف امتزاجی ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ علما اپنی عمیق متصوفانہ تفسیروں پر عمل کرنے کی بجائے ایرانیت زدہ ہو گئے۔ محمد باقر مجلسی (وفات 1700ء) ایک سب سے زیادہ اثر آفریں عالم بن گئے تاہم انہوں نے ایک نئے شیعہ تعصب کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے اصفہان میں فلسفہ اور عرفان کی تعلیمات کو دبانے کی کوشش کی اور بچے کھچے صوفیا کو بے رحمی کے ساتھ سزاؤں کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد وہ اس قابل ہو گئے کہ فقہ پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے علماء پر زور دیں۔ مجلسی نے ایرانی شیعیت میں فلسفے اور تصوف کے بارے میں بے اعتمادی کو متعارف کروایا جو کہ آج تک غالب چلی آ رہی ہے۔

مجلسی نے صوفیوں کے اجتماعی ذکر اور اولیاء کے مسلکوں کی جگہ شہید کربلا حضرت حسینؓ کے احترام میں ماتمی رسومات کو فروغ دیا تا کہ لوگوں کو شیعہ اقدار اور عقائد کا درس دیا جائے۔ بڑے بڑے جلوس نکالے جاتے، جن میں جذباتی نوحے اور مرثیے پڑھے جاتے جبکہ لوگ زور زور سے روتے اور ماتم کرتے تھے۔ یہ رسومات اہم ایرانی روایت بن گئیں۔ اٹھارہویں صدی کے دوران تعزیہ کو رواج دیا گیا جس میں لوگ غیر فعال تماشائی نہیں ہوتے تھے بلکہ جذباتی ردعمل کرتے ہوئے، گریہ وزاری کرتے اور اپنی چھاتیاں پیٹتے اور حضرت امام حسینؓ کے مصائب کے ساتھ اپنے دکھوں کا امتزاج کرتے تھے۔ ان رسومات نے ایک اہم

سیفٹی والو کا کام دیا۔ جب وہ اپنے ماتھوں کو پیٹتے اور بے قابو ہو کر روتے تو سامعین اپنے اندر عدل و انصاف کی ویسی ہی آرزو ابھرتی ہوئی محسوس کرتے جو کہ شیعہ عقائد میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتے کہ ایسا کیوں ہے کہ حق ہمیشہ کرب و بلا کا شکار رہتا ہے اور باطل قریباً ہمیشہ ہی غالب رہتا ہے؟ تاہم مجلسی اور شاہوں نے ان رسومات کے انقلابی جوہر کو دبانے میں احتیاط سے کام لیا۔ لوگوں کو درس دیا گیا کہ داخلی جبر و استبداد کے خلاف احتجاج کرنے کی بجائے سنی جماعت کے خلاف سرگرم ہوں۔ لوگوں کو حضرت حسینؓ کی طرح ناانصافی کے خلاف جدوجہد کی ہدایت کرنے کی بجائے انہیں بتایا گیا کہ وہ انہیں ایک سرپرست تصور کریں جو کہ انہیں جنت میں بھجوائیں گے۔ اس طرح وہ رسمیں غیر جانبدارانہ ہو کر رہ گئیں اور حالتِ موجودہ (سٹیٹس کو) برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ وہ لوگوں کو طاقتوروں کی حمایت حاصل کرنے اور صرف اپنے مفادات کے حصول پر زور دیتی تھیں۔ ایسا صرف 1978-9ء کے انقلاب ایران کی وجہ سے ہوا کہ یہ مسلک ایک مرتبہ پھر محکوموں اور مجبوروں کے لیے بدعنوان حکومت کے خلاف اپنے غم و غصے کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔

تاہم کچھ علما پرانی شیعی روایات سے مخلص رہے اور ان کے نظریات نہ صرف ایران بلکہ ساری مسلم دنیا میں آج تک مصلحین اور انقلابیوں کو متاثر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ میر دیمد (وفات 1631ء) اور ان کے شاگرد مُلّا صدرا (وفات 1640ء) نے اصفہان میں متصوفانہ فلسفے کا ایک مکتب قائم کیا جس کو مجلسی نے دبانے کی بہت کوششیں کیں۔ انہوں نے فلسفے اور روحانیت کو ملاتے ہوئے سہروردیہ روایت کو جاری رکھا اور اپنے شاگردوں کو صوفیانہ اصولوں کی تربیت دی جو انہیں عالم مثال اور روحانی دنیا کا شعور حاصل کرنے کے قابل بناتے تھے۔ دونوں نے زور دیا کہ ایک فلسفی کو نہ صرف ارسطو کی طرح عقلیت پسند اور سائنسی ہونا چاہیے بلکہ اُسے حق کی ایک تخیلاتی اور وجدانی سوچ بھی پیدا کرنی چاہیے۔ ان دونوں نے کچھ علماء کے عدم برداشت کے نئے رویے کی مخالفت کی، جسے وہ مذہب سے انحراف تصور کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حق کو زبردستی نافذ نہیں کیا جا سکتا اور دانش ورانہ ادعائیت حقیقی مذہب کے خلاف ہے۔ مُلّا صدرا سیاسی اصلاح کو روحانیت سے الگ تصور نہیں کرتے تھے۔ اپنی شاہکار تصنیف ''الافسان الاربعہ'' میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ کسی قائد کو عالم مادی کی قلبِ ماہیئت

کرنے سے پہلے متصوفانہ تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ اُسے پہلے اپنی انا سے لازماً چھٹکارہ پانا اور الوہی تنویر حاصل کرنا چاہیے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر وہ شیعہ اماموں جیسی ...... گو ان کی سطح سے کم تر' روحانی بصیرت حاصل کرلے گا۔ آیت اللہ خمینی ملّا صدرا کی تعلیمات سے بہت زیادہ متاثر تھے اور اپنی وفات سے پہلے ایرانی قوم سے کیے گئے اپنے آخری خطاب میں انہوں نے ہدایت کی تھی کہ عرفان کا مطالعہ اور اس پر عمل جاری رکھا جائے کیونکہ اس وقت تک سچا اسلامی انقلاب برپا نہیں ہوسکتا جب تک روحانی اصلاح نہ ہوچکی ہو۔

ملّا صدرا کو ایک بالکل نئے نظریے نے پریشان کردیا تھا جو رفتہ رفتہ ایران کے علماء میں جگہ بنا رہا تھا اور جو کہ ہمارے زمانے تک دوررس سیاسی اثرات ونتائج مرتب کررہا ہے۔ ایک گروہ' جو اپنے آپ کو اصولی کہلواتا تھا' یہ ایمان رکھتا تھا کہ عام مسلمان مذہب کے بنیادی اصولوں کی تفہیم وتعبیر سے قاصر ہیں۔ لہٰذا انہیں کسی نہ کسی فاضل عالم کی پیروی کرنی چاہیے اور اُس کے قانونی احکامات کو ماننا چاہیے کیونکہ صرف ایسے علماء ہی امام غائب کے استناد (اتھارٹی) کے حامل ہیں۔ شیعہ علماء سنی علماء کی طرح کبھی ''اجتہاد کے دروازے'' بند رکھنے پر متفق نہیں ہوئے تھے۔ وہ کسی نمایاں قانون داں کو مجتہد کہا کرتے تھے یعنی ایک ایسا فرد جسے ''آزادانہ استدلال'' کے ذریعے اسلامی قانون سازی کا حق حاصل ہو۔ اصولیوں کا کہنا تھا کہ شاہ کو بھی مجتہد کے فتوؤں کی پیروی کرنی چاہیے اور اُسے اپنا ناصح منتخب کرنا چاہیے کیونکہ اُسے اس کی قانونی مہارت کی ضرورت ہے۔ سترہویں صدی کے دوران تو اصولیوں کو زیادہ تائید و حمایت حاصل نہیں ہوئی تاہم اس صدی کے اختتام پر انہیں حمایت حاصل ہوگئی' جب یہ واضح ہوگیا تھا کہ ریاست کی کمزوریوں کی تلافی کے لیے ایک مضبوط قانونی مقتدرہ قائم کی جائے۔

اس وقت سلطنت کسی بھی زرعی معیشت والے انجام سے دوچار ہوچکی تھی اور زیادہ عرصہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی اہل نہیں رہی تھی۔ تجارت تباہ ہوچکی تھی' معاشی عدم تحفظ تھا اور بعد میں آنے والے شاہ نااہل نکلے۔ جب 1722ء میں افغان قبیلوں نے اصفہان پر حملہ کیا تو شہر نے رسوا کن انداز میں ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک صفوی شہزادہ قتل عام سے بچ نکلا اور اس نے ذہین مگر بے رحم کماندار نادر خان کی مدد سے حملہ آوروں کو نکال باہر کیا۔ نادر خان نے اپنے صفوی ساتھی سے نجات پالی اور شاہ بن گیا۔ اس نے ایران پر بیس برس حکومت کی اور اہم

عسکری فتوحات حاصل کیں۔ وہ ایک سفاک اور ظالم انسان تھا۔ 1748ء میں اُسے قتل کردیا گیا۔ اس عرصے کے دوران دو اہم واقعات کے نتیجے میں ایران کے علماء کو ایسی طاقت اور اختیار حاصل ہوگیا جس کا موازنہ اسلامی دنیا میں کہیں اور نہیں کیا جا سکتا۔ پہلا واقعہ تو یہ تھا کہ جب نادر خان نے ایران میں سنی اسلام کو نافذ کرنے کی ناکام کوشش کی تو نمایاں علماء نے سلطنت کو چھوڑ دیا اور مقدس شیعہ شہروں نجف اور کربلا چلے گئے (جو کہ بالترتیب حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ سے موسوم تھے) پہلے تو یہ ایک بربادی دکھائی دی تاہم انہیں عثمانی عراق میں واقع نجف اور کربلا میں ایک ایسا مرکز دستیاب ہوگیا جہاں سے وہ ایران کے عارضی حکمرانوں کی دسترس سے دور رہ کر لوگوں کو ہدایات دے سکتے تھے۔ دوسرا واقعہ یہ تھا کہ نادرخان کی ہلاکت کے بعد کسی حکومت سے عاری سیاہ دور میں جب ایران مرکزی مقتدرہ سے محروم تھا تو ترکمان قاچار قبیلے سے تعلق رکھنے والے آقا محمد نے 1779ء میں اقتدار پر قبضہ جما لیا اور قاچار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ علماء اس اقتدار کے خلا میں داخل ہوگئے۔ اصولی حیثیت انتدابی ہوگئی اور واقعات نے ظاہر کیا کہ علماء کسی شاہ سے زیادہ مؤثر انداز میں ایرانی عوام کی وفاداری اور فرماں برداری کو ممکن بنا سکتے ہیں۔

مغل سلطنت

ہندوستان میں نئی اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کا ذمہ دار ایک حد تک سنی مسلمانوں کے خلاف شاہ اسمٰعیل کے جہاد سے پیدا ہونے والا بحران بھی تھا۔ اس کا بانی بابر (وفات 1530ء) اسمٰعیل کا ایک اتحادی رہ چکا تھا اور صفویوں اور ازبکوں کی جنگ کے دوران اس نے فرار ہوکر کابل میں پناہ لے لی تھی جہاں اس نے تیمور لنگ کی قائم کردہ ریاست کی باقیات پر قبضہ کرلیا۔ پھر اُس نے شمالی ہندوستان میں ایک مرکز قوت قائم کرلیا جسے وہ تیمور کے خطوط پر چلانا چاہتا تھا۔ اس کی ریاست زیادہ عرصہ نہیں چلی اور 1555ء تک افغان امیروں کے مابین سر پھٹوّل ہوتا رہا۔ تب بابر کا سب سے اہل بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اگر چہ وہ جلد ہی وفات پا گیا تاہم ایک قائم مقام شاہ نے مغل اقتدار کو سنبھالے رکھا۔ تاوقتیکہ ہمایوں کے بیٹے اکبر (1605ء۔ 1542ء) نے 1560ء میں تاج شاہی پہنا۔ اکبر نے شمالی ہندوستان میں ایک متحد ریاست قائم کی جہاں اُسے غیر متنازعہ حکمران تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس نے قدیم منگول روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مرکزی حکومت کو اس طرح چلایا جس طرح کوئی فوج سلطان کی براہ راست کمان میں ہوتی تھی۔ اس نے ایک اہل انتظامیہ (بیوروکریسی) تعینات کی اور اپنے آتشیں ہتھیاروں کے بل پر دوسرے مسلمان حکمرانوں کے علاقوں پر قبضہ کرتا چلا گیا اور پنجاب، مالوہ اور دکن پر قابض ہوگیا۔

تاہم اسمٰعیل کے برخلاف اکبر نے اپنی رعایا پر نہ تو جبر کیا اور نہ انہیں سزا و عذاب دیئے۔ اس نے انہیں اپنا مذہب قبول کرنے پر بھی مجبور نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اُس کی سلطنت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ ملک میں مسلمان ایک قلیل حکمران اقلیت تھے، جس نے کبھی مذہبی کٹرپن کو نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہندوؤں کی تمام ذاتوں نیز بدھوں، یہودیوں، جینوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی اجازت تھی۔

سنی مسلمان اور اسمٰعیلی بلارکاوٹ عبادات کیا کرتے تھے۔ چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران ہندوؤں کی تمام ذاتوں اور کچھ مسلمانوں نے مل کر وحدانیت کی ایک روحانی مراقباتی صورت کو اپنایا جس سے مذہبی رواداری کو فروغ ملا۔ گرونانک (وفات 1539ء) نے سکھ مذہب کی بنیاد رکھی۔ یہ بھی انہی حلقوں سے ابھرا تھا جو ہندومت اور اسلام کی ہم آہنگی پر زور دیتے تھے۔ تاہم جارحانہ تصادم کا امکان ہر وقت موجود رہتا تھا۔ ہندوستان میں آفاقیت مضبوطی سے قائم تھی اور ایک عدم برداشت والا حکومتی نظام ہندوستانی ثقافت کی روح کے خلاف ہوتا۔ مسلمان حکمرانوں کو طویل عرصے سے اس حقیقت کا ادراک تھا اسی لیے انہوں نے اپنی فوج اور انتظامیہ میں ہندوؤں کو ملازمتیں دی تھیں۔ اکبر نے اس روایت کو مزید مستحکم کیا۔ اس نے ذمیوں پر شریعت کا تجویز کردہ ٹیکس جزیہ وصول کرنا بند کروا دیا۔ وہ سبزی خور بن گیا تاکہ ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے اور شکار (جو ایک ایسا کھیل تھا جس سے وہ بے حد لطف اندوز ہوتا تھا) ترک کر دیا۔ اکبر تمام مذاہب کا احترام کرتا تھا۔ اُس نے ہندوؤں کے لیے مندر تعمیر کروائے اور 1575ء میں اُس نے ایک ''پرستش گاہ'' (House of Worship) تعمیر کروائی جہاں تمام مذہبوں کے علماء (سکالرز) تبادلہ خیالات کے لیے اکٹھے ہو سکتے تھے۔ اس نے ایک اپنا صوفیانہ سلسلہ بھی قائم کیا تھا جو کہ ''توحید الٰہی'' پر مبنی تھا۔ اس کی بنیاد اس قرآنی عقیدے پر تھی کہ خدائے واحد اپنے آپ کو کسی بھی مذہب میں منکشف کر سکتا ہے۔

اگرچہ اکبر کا یہ رویہ حقیقتاً قرآن کی روح کے مطابق تھا مگر کچھ شریعتی حلقوں میں پروان چڑھ جانے والی کٹر تفرقہ پسندی کے خلاف تھا نیز حالیہ سنی شیعہ تنازع کی وجہ سے بھی اس زمانے میں تعصب کا دور دورہ تھا لیکن ہندوستان میں کوئی اور پالیسی سیاسی حوالے سے تباہ کن ثابت ہوتی۔ اکبر نے اپنے عہد اقتدار کے آغاز میں تو علماء کو اہمیت دی تھی تاہم اُسے شریعت سے کبھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کا ذاتی جھکاؤ تصوف اور فلسفے کی طرف تھا اور دونوں ہی ایک آفاقی وژن کی طرف مائل تھے۔ اکبر اس مثالی معاشرے کو قائم کرنا چاہتا تھا جس کے بارے میں فیلسوف لکھ چکے تھے۔ اس کے سوانح نگار ابوالفضل علامی (1602ء۔1551ء) نے اکبر کو ایک فلسفی بادشاہ کے طور پر دیکھا ہے۔ اس کو یہ بھی یقین تھا کہ وہ ایک ایسا کامل انسان (Perfect Man) ہے' جس کے بارے میں صوفیا کا خیال تھا کہ ایسا انسان ہر نسل میں اُمت کی الوہی رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہوتا ہے۔ علامی کہتا

ہے کہ اکبر ایک تہذیب کو تشکیل دے رہا تھا جو لوگوں میں ایسی فیاضانہ روح پیدا کردیتی کہ لڑائی جھگڑا ناممکن ہوجاتا۔ یہ ایک ایسی حکمتِ عملی تھی جو صوفیا کے ''صلح کل'' کے آدرش کی ترجمانی کرتی تھی' جوکہ ''محبتِ کل'' کی شروعات ہوتی ہے جس کے تحت کل نوعِ انسان کی ماڈی اور روحانی بھلائی عمل میں آتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے تعصب ناروا تھا۔ اکبر جیسا مثالی فیلسوف بادشاہ تنگ نظر تفرقہ پسندی کے تعصب سے بالاتر تھا۔

تاہم کچھ مسلمان اکبر کی مذہبی تکثیریت پر مشتعل تھے۔ احمد سرہندی (وفات 1625ء) نے' جو صوفی بھی تھے' محسوس کیا کہ یہ تکثیریت (جسے انہوں نے ابن العربی سے موسوم کیا تھا) خطرناک ہے۔ احمد سرہندیؒ کا دعویٰ تھا کہ اکبر کی بجائے وہ خود اس دور کے کامل انسان ہیں۔ خدا کی قربت صرف اُسی وقت حاصل کی جاسکتی ہے جب مسلمان شریعت کے قوانین کی پابندی کریں' جوکہ اس وقت تک ظاہری طور پر زیادہ تفرقہ پسندانہ ہوچکی تھی۔ تاہم سترہویں صدی کے ابتدائی حصے میں ہندوستان کے تھوڑے ہی مسلمانوں نے احمد سرہندیؒ کے نظریات کو تسلیم کیا۔ اکبر کے پوتے شاہ جہاں نے' جو 1627ء سے 1658ء تک بادشاہ رہا' اکبر کی پالیسیوں کے بنیادی اجزاء کو برقرار رکھا۔ اس کا تعمیر کروایا ہوا تاج محل اس کے دادا کی مسلم اور ہندو طرزِ تعمیر کے امتزاج کی روایت کا تسلسل ہے۔ اس نے ہندو شاعروں کی سرپرستی کی اور مسلمانوں کی سائنسی تصنیفات کو سنسکرت میں ترجمہ کروایا۔ تاہم شاہ جہاں تصوف کا دشمن تھا اور اکبر کے برخلاف اس کا عقیدہ شریعت پر زیادہ استوار تھا۔

وہ ایک عبوری شخصیت ثابت ہوا۔ اُس صدی کے اختتام تک یہ واضح ہوگیا تھا کہ مغل سلطنت کا زوال شروع ہوچکا ہے۔ فوج اور دربار کے مصارف بہت زیادہ ہوگئے' بادشاہ اب بھی ثقافتی سرگرمیوں پر سرمایہ لٹا رہے تھے۔ مگر انہوں نے زراعت کو نظرانداز کررکھا تھا جس پر ان کی دولت کا انحصار تھا۔ معاشی بحران اورنگ زیب (1707ء۔ 1658ء) کے عہد میں نمایاں ہوگیا' جس کو یقین تھا کہ اس بحران کا حل مسلمان معاشرے کے بہت زیادہ نظم و ضبط میں مضمر ہے۔ اس کے عدم تحفظ کا اظہار دوسرے عقیدوں کے ماننے والوں کے ساتھ ساتھ مسلمان ''بدعتیوں'' سے ہلاکت انگیز نفرت سے ہوا۔ اس کی فرقہ وارانہ پالیسیوں کی حمایت' احمد سرہندیؒ جیسے پرانی تکثیریت سے ناخوش مسلمانوں نے کی۔ ہندوستان میں حضرت امام حسینؓ کے احترام میں شیعوں کے اجتماعات پر پابندی لگا دی گئی۔ شراب قانوناً ممنوع قرار دے دی گئی۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں سے میل جول مشکل ہوگیا۔ اور ہندوؤں

کے میلوں میں بادشاہ کی شرکت میں بے حد کمی آ گئی۔ جزیہ دوبارہ نافذ کر دیا گیا اور ہندو تاجروں پر عائد ٹیکس دگنے کر دیئے گئے۔

اس کے ردعمل سے ظاہر ہوا کہ سابقہ رواداری کتنی دانش مندانہ تھی۔ ہندو اور سکھوں نے پنجاب میں اپنی ریاست کے لیے بغاوت کر دی۔ جب اورنگزیب فوت ہوا تو سلطنت انتشار کی زد میں تھی اور پھر کبھی پوری طرح سنبھل نہیں سکی۔ اس کے جانشینوں نے فرقہ پسندانہ پالیسیاں ترک کر دیں۔ مگر جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان بھی مطمئن نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شریعت کے لیے اورنگزیب کا جوش و جذبہ مسلمہ طور پر اسلامی نہیں تھا۔ اسلام تو ذمیوں سمیت سب کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کی ہدایت کرتا ہے۔ سلطنت ٹوٹنا شروع ہوگئی اور مقامی مسلمان حکمران اپنے اپنے علاقوں کو خودمختار قرار دینے لگے۔

تاہم 1739ء تک مغلوں نے اپنا اقتدار برقرار رکھا جبکہ اٹھارہویں صدی کے دوران دربار میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تعلقات کی تجدید ہوگئی۔ انہوں نے ایک دوسری کی زبانیں بولنا سیکھا اور یورپی کتابوں کا مطالعہ اور ترجمہ ایک ساتھ کرنے لگے۔ تاہم پہاڑی علاقوں کے ہندو اور سکھ سرداروں نے حکومت سے لڑنا جاری رکھا اور شمال مغرب میں افغان قبائل نے، جو کہ ایران میں صفوی سلطنت کو گرا چکے تھے، ہندوستان میں ایک نئی مسلمان سلطنت قائم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی حالت کے بارے میں بے آرامی محسوس کرنا شروع کی اور ان کے مسائل جدید عہد تک جاری رہنے والی بہت سی دشواریوں اور مباحثوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ تو ایک ایسے علاقے میں گھرے ہوئے ہیں جو عثمانی سلطنت کے اناطولیہ کی طرح محیط والا علاقہ نہیں ہے بلکہ مہذب دنیا کی ایک مرکزی ثقافت ہے۔ وہ نہ صرف ہندوؤں اور سکھوں سے حالتِ جنگ میں تھے بلکہ برطانوی بھی برصغیر میں تجارتی حوالے سے مضبوط حیثیت حاصل کرتے جا رہے تھے، جو کہ رفتہ رفتہ سیاسی ہوتی جا رہی تھی۔ پہلی مرتبہ مسلمانوں کو کافروں کی محکومی کے امکان کا سامنا تھا اور مذہبِ اسلام میں امت کی اہمیت کے پیش نظر یہ بہت زیادہ پریشان کن تھا۔ یہ فقط سیاسی معاملہ ہی نہیں تھا بلکہ اس نے ان کی ہستی کے عمیق ترین گوشوں کو چھو لیا تھا۔ ہندوستان میں ایک نیا عدم تحفظ مسلم زندگی کی خصوصیت بن گیا۔ کیا مسلمان بھی ہندوؤں کی ایک ذات بن کر رہ جائیں گے؟ کیا مسلمان اپنا ثقافتی اور مذہبی تشخص گنوا دیں گے اور ان کی

جگہ غیر ملکی روایات لے لیں گی جو کہ مشرقِ وسطیٰ کی ان روایات سے مختلف تھیں جن میں اسلام پیدا ہوا تھا؟ کیا وہ اپنی جڑوں سے ربط کھو چکے ہیں؟

صوفی مفکر شاہ ولی اللہ (1703-62ء) کو یقین تھا کہ ان سوالوں کا جواب سرہندی کے موقف میں نہاں ہے۔ ان کے خیالات ہندوستان کے مسلمانوں پر بیسویں صدی تک اثر انداز رہے۔ انہوں نے ایک نئی جنگجویانہ بصیرت کا اظہار کیا اور چونکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں مسلمان اقتدار کو جاتا ہوا محسوس کر رہے تھے اور اسلام کی بقا کے حوالے سے اسی طرح کے خوف سے گزر رہے تھے' اس لیے دوسرے فلسفی اور مصلحین بھی ایسے ہی نتائج تک پہنچے۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو لازماً متحد ہو جانا چاہیے' فرقہ وارانہ اختلافات کو دفن کر دینا چاہیے اور اپنے دشمنوں کا مل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ برصغیر کی خصوصی صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لیے شریعت کو لازماً اختیار کرنا چاہیے اور اس کے ذریعے ہندویت (Hiduization) کی مزاحمت کرنی چاہیے۔ انتہائی لازمی ہے کہ مسلمان عسکری اور سیاسی اعتبار سے بالا دست رہیں۔ شاہ ولی اللہ اس قدر فکرمند تھے کہ انہوں نے مسلم قوت و اقتدار کے احیاء کے لیے افغانوں کی تباہ کن کاوشوں میں بھی معاونت کی۔ یوں اسلامی سوچ میں ایک مزاحمانہ انداز داخل ہو گیا جس نے جدید عہد تک اسلام کی خصوصیت بن کر جاری رہنا تھا۔

عثمانی سلطنت

جب 1453ء میں عثمانیوں نے قسطنطنیہ (جسے اب استنبول کہتے ہیں) کو فتح کیا تو وہ اس حیثیت میں تھے کہ ایک سلطنت کو قائم کر سکیں۔ چونکہ انہوں نے اسے مرحلہ وار تشکیل دیا تھا اس لیے دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں وہ زیادہ مضبوطی سے استوار ہوئی اور سب سے زیادہ کامیاب اور مضبوط سلطنت بن گئی۔ ابتدائی عثمانی سردار مخصوص قسم کے غازی حکمران تھے مگر استنبول میں سلطانوں نے بازنطین کو مثال بنا کر ایک مطلق بادشاہت قائم کر لی اور دربار تشکیل دے لیا۔ تاہم ریاست کی بنیاد پرانا منگول نظریہ ہی تھا جس کے مطابق مرکزی طاقت فوج ہوتی اور اس کی کمان سلطان کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ محمد فاتح کی قوت کا دارومدار بالقان کی اشرافیہ پر تھا جس سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ ینی چری پر مشتمل توپ خانہ اس کی قوت کا سرچشمہ تھا' جو کہ بارود کی ایجاد کے بعد زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ ینی چری ایسے غلام تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے کوئی مفادات نہیں تھے۔ وہ ایک آزاد فوج بن گئے تھے جو سلطان کی پشت پناہ تھی۔ عثمانیوں نے پرانے مثالیے کی اخلاقیات کو برقرار رکھا اور خود کو اسلام کے دشمنوں کے خلاف جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ مغرب میں ان کا سامنا عیسائیت سے اور مشرق میں شیعہ صفویوں سے تھا۔ عثمانی صفویوں کی طرح خوفناک حد تک فرقہ پسند بن گئے تھے اور انہوں نے عثمانی علاقوں میں بسنے والے شیعوں کا قتل عام کیا۔

جہاد غیر معمولی حد تک کامیاب رہا۔ صفویوں کے خلاف سلیم اول (1467ء-1520ء) کی مہم' جس نے ایرانی پیش رفت کو روک دیا' فاتحانہ جنگ میں تبدیل ہو گئی جس کے نتیجے میں شام اور مصر عثمانی حکمرانی میں آ گئے۔ علاوہ ازیں شمالی افریقہ اور عرب بھی سلطنت میں شامل

کر لیے گئے۔ مغرب میں عثمانی افواج نے یورپ کو فتح کرنا جاری رکھا اور 1530ء کی دہائی میں ویانا کے دروازوں تک پہنچ گئیں۔ اب سلطان ایک وسیع و عریض سلطنت پر زبردست انتظامی اہلیت کے ساتھ حکومت کر رہے تھے۔ اس حوالے سے اُس زمانے میں کوئی ریاست ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ سلطان نے نہ تو اپنی رعایا پر یک رنگی مسلط کی اور نہ ہی اپنی سلطنت کے الگ الگ عناصر کو ایک ہی بڑی جماعت میں ڈھلنے پر مجبور کیا۔ حکومت صرف لائحہ عمل مہیا کر دیتی جس کے تحت مختلف گروہ ـــ عیسائی' یہودی' عرب' ترک' بربر' تاجر' علماء' صوفیا اور تجارتی تنظیمیں ـــ امن و امان کے ساتھ رہتے تھے' ہر کوئی اپنا اپنا کردار ادا کرتا اور اپنے عقائد اور رسوم و روایات پر عمل کرتا تھا۔ اس طرح وہ سلطنت مختلف برادریوں کا ایک مجموعہ بن گئی تھی جس کا ہر فرد وفاداری کا اعلان کرتا تھا۔ سلطنت کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن پر پاشا (گورنر) حکومت کرتے تھے جو براہ راست سلطان کو جواب دہ ہوتے تھے۔

سلیمان القانونی (66-1520ء)' جسے مغرب میں سلیمان عالی شان کے نام سے جانا جاتا ہے' کی حکمرانی میں سلطنت اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس کے دور حکومت میں سلطنت اپنی وسعت کی حدوں کو پہنچ گئی اور استنبول میں ایک ثقافتی نشاۃ ثانیہ رونما ہوئی جس کی بنیادی خصوصیت غیر معمولی فن تعمیر تھا' جس کا اہم نمائندہ درباری ماہر تعمیرات سنان پاشا (وفات 1578ء) تھا۔ عثمانی مساجد' جو پوری سلطنت میں تعمیر کی گئی تھیں' ایک منفرد اسلوب کی عکاسی کرتی تھیں: وہ مسجدیں کشادہ' روشن' چھوٹے گنبدوں اور بلند میناروں والی ہوتی تھیں۔ سلطان مصوری' تاریخ اور طب کی بھی سرپرستی کرتا تھا۔

1579ء میں ایک رصدگاہ (Observatory) تعمیر کرائی گئی اور جہازرانی اور جغرافیہ میں نئی یورپی دریافتوں سے استفادہ کیا گیا۔ ان توسیعی برسوں میں مغرب سے معلومات کا تبادلہ کیا گیا' جب یورپ کے کارناموں کے باوجود عثمانی ریاست دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور تھی۔

دوسری دونوں سلطنتوں کی طرح عثمانیوں نے بھی اپنی سلطنت کو اسلامی بنیاد فراہم کی۔ سلیمان کے عہد میں شریعت کو کسی بھی گزشتہ مسلم ریاست سے زیادہ اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ اسے سلطنت کے تمام مسلمانوں کے لیے سرکاری قانون بنا دیا گیا اور عثمانیوں نے پہلی مرتبہ شرعی عدالتیں قائم کیں۔ قاضی' مفتی اور مدرسوں کے اساتذہ سلطان اور اس کی رعایا میں ایک اخلاقی اور مذہبی تعلق پیدا کرتے تھے۔ یہ چیز عرب صوبوں میں زیادہ کارآمد ثابت ہوئی

جہاں علماء لوگوں کو ترک حکومت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔ علماء نہ صرف مقدس قانون کے بل بوتے پر حکومت کو جواز عطا کرتے تھے بلکہ چونکہ وہ کسی خاص صوبے کے مقامی لوگ ہی ہوتے تھے' اس لیے مقامی آبادی اور ترک گورنر کے درمیان اہم رابطے کا کام انجام دیتے تھے۔

اہم بات یہ تھی کہ عثمانی رعایا ایک شرعی ریاست سے تعلق رکھنے پر فخر کرتی تھی۔ قرآن کی تعلیمات تھیں کہ امت قرآن کے قوانین کے مطابق چلے تو خوشحال ہوگی کیونکہ وہ ہستی کے بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ ہوگی۔ اولین عثمانیوں کی غیر معمولی کامیابیوں کو ان کی خدا کے قانون سے وابستگی کا انعام تصور کیا گیا۔ علماء یہ بھی محسوس کر سکتے تھے کہ ریاست ان کی ہے اور یہ کہ عثمانیوں نے سرکاری پالیسی اور مسلم ضمیر میں ایک شاذ اتحاد قائم کر دیا ہے۔ تاہم ثمر آور ہونے کے باوجود اس اشتراک کا ایک منفی پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ علماء کو طاقتور بنا دینے کے باوجود آخرکار انہیں اعتماد سے محروم گردانا جاتا تھا۔ شریعت ایک احتجاجی تحریک کی حیثیت سے شروع ہوئی تھی اور اس کی زیادہ تر حرکیت (Dynamism) اس کے اختلافی روپ سے اخذ شدہ تھی۔ عثمانی اقتدار کے تحت یہ حرکیت ناگزیر طور پر کھو گئی اور علماء ریاست پر انحصار کرنے لگے۔ سلطان اور اس کے پاشا انہیں حکومتی اہلکار کی حیثیت میں ان سے مراعات چھین لینے کا ڈراوا دے کر کنٹرول کر سکتے تھے ـــ اور انہوں نے ایسا کیا بھی۔ انہوں نے واضح کیا کہ قاضی شریعت کے سرپرست سلطان سے اپنی اتھارٹی حاصل کرتے ہیں لہٰذا وہ اس کی ہدایات کے مطابق قانون نافذ کرنے کے پابند ہیں۔ اس طرح شریعت مطلق بادشاہت کے نظام کو تقویت دینے لگی (جو کہ اب پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو گیا تھا) حالانکہ وہ تو حقیقت میں اس کی مخالفت کے لیے وضع کی گئی تھی۔

ایران کے شیعہ علماء ریاست سے آزاد تھے اور انہیں عوام کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ بہت سے ایرانی علماء سرگرم مصلح (ریفارمر) بن گئے اور انہوں نے جابر شاہوں کے خلاف عوام کو موثر قیادت فراہم کی۔ کافی تعداد میں علماء نے جدید دور کے جمہوری اور آزادانہ (لبرل) تصورات کو قبول کیا۔ لیکن عثمانی سلطنت میں علماء کمزور ہو گئے تھے اور اپنی سیاسی اہمیت گنوا چکے تھے۔ وہ روایت پسند بن گئے تھے اور ہر تبدیلی کی مخالفت کرتے تھے۔ سلیمان کے عہد حکومت کے بعد مدرسوں کا نصاب مزید محدود ہو گیا اور فقہ کو زبردست اہمیت دیتے ہوئے فلسفے کو خارج کر دیا گیا۔ عثمانی سلطنت' جو ایک بڑی ''غازی'' ریاست تھی' فرقہ

پسندانہ سلطنت تھی۔ مسلمان اپنے آپ کو کافروں کے مقابلے میں روایت پسندی کے علمبردار محسوس کرتے تھے۔ علماء اور حتیٰ کہ صوفیا بھی اسی نظریے کو مانتے تھے اور جب پہلی مرتبہ سلطنت کی کمزوری کی علامات ظاہر ہوئیں تو یہ رجحان زیادہ نمایاں ہوگیا۔ جہاں دربار میں اب بھی یورپ سے آنے والے نئے تصورات کو خوش آمدید کہا جاتا تھا وہاں مدرسے یورپی کافروں سے اخذ کردہ تجربیت کی مخالفت کے گڑھ بن گئے۔ مثال کے طور پر علماء نے اسلامی کتابوں کے لیے پریس استعمال کرنے کی مخالفت کی۔ وہ سلطنت میں بسنے والے عیسائیوں سے دور رہنے لگے، جن میں سے بہت سے لوگ نئے مغرب کو اشتیاق کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ علماء کے عوام پر اثرات نے عثمانی معاشرے کے اہم پہلوؤں کو مخصوص رنگ دے دیا تھا اور انہیں ایک ایسے زمانے میں تبدیلی کا مخالف بنا دیا تھا جب تبدیلی ناگزیر تھی۔ جب مغربی جدیدیت اسلامی دنیا میں وارد ہوئی تو علماء پرانی اقدار سے چمٹے ہونے کی وجہ سے لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکے اور انہیں رہنمائی کے لیے کسی اور طرف دیکھنا پڑا۔

عثمانی سلطنت بھی ایک زرعی معاشرے کی حامل تھی جو سلطنت کی توسیع کا ساتھ نہیں دے سکا۔ عسکری نظم کمزور ہوگیا اور سلطانوں نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ عرصہ مطلق اقتدار سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ معاشی عدم استحکام نے بدعنوانی اور ٹیکس چوری کو فروغ دیا۔ محصولات میں کمی ہو رہی تھی اور بالائی طبقہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ زیادہ مؤثر یورپی مقابلے کی وجہ سے تجارت میں زوال آ گیا تھا اور مقامی گورنر سرکشی اختیار کر رہے تھے۔ اس کے باوجود سلطنت منہدم نہیں ہوئی۔ پوری سترہویں صدی کے دوران ایک جاندار ثقافتی زندگی برقرار رہی۔ تاہم اٹھارہویں صدی تک زوال واضح ہوگیا تھا، خاص طور پر دور دراز کے علاقوں میں۔ وہاں کے مقامی مصلحین نے مذہبی اصلاح کے ذریعے نظام کو بحال کرنے کی کوششیں کیں۔

جزیرہ نمائے عرب میں محمد بن عبدالوہاب (1703-92ء) نے استنبول سے الگ ہو کر وسطی عرب اور خلیج فارس میں ایک ریاست قائم کر لی۔ وہ ابن تیمیہؒ کی روایت سے تعلق رکھنے والے مصلح تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ موجودہ بحران کا مقابلہ قرآن اور سنت کی طرف بنیاد پرستانہ واپسی سے کیا جا سکتا ہے نیز بعد میں ہونے والے اضافوں کے عسکری استرداد کے ذریعے اس بحران سے نمٹا جا سکتا ہے۔ ان اضافوں میں شامل تھے وسطی عہد کے فقہ، تصوف اور فلسفہ جنہیں بیشتر مسلمان روایتی ہی تصور کرتے تھے۔ چونکہ عثمانی سلطان عبدالوہاب کے

سچے اسلام کے تصور پر پورا نہیں اترتے تھے لہٰذا انہوں نے ان کو مرتد قرار دے دیا اور موت کا سزاوار ٹھہرایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ساتویں صدی کی اولین امت کے اپنے تصور کی بنیاد پر خالص عقیدہ وضع کرنے کی کوشش کی۔ ان کی جارحانہ تیکنیکوں کو بیسویں صدی میں کچھ بنیاد پرستوں نے استعمال کرنا تھا' جو کہ زبردست تبدیلی اور بدامنی کا زمانہ تھا۔ وہابیت پر آج بھی سعودی عرب میں عمل کیا جاتا ہے' یہ اسلام کی ایک ایسی شکل ہے جو قرآن اور اولین اسلامی روایت کی لفظی تعبیر پر استوار ہے۔

مراکش میں احمد بن ادریس (1836ء۔ 1760ء) نے مسئلے کا مختلف حل نکالا۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو تعلیم دی جائے اور انہیں زیادہ اچھا مسلمان بنایا جائے۔ انہوں نے شمالی افریقہ اور یمن میں سفر کرتے ہوئے عام لوگوں کو انہی کی بولی میں صلوٰۃ جیسی بنیادی عبادات کی درست ادائیگی کی تعلیم دی۔ ان کے خیال میں علماء اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام ہو گئے تھے' انہوں نے خود کو مدرسوں میں عوام سے دور کرلیا تھا' صرف فقہ کی باریکیوں میں دلچسپی لیتے تھے اور لوگوں کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے نئے صوفیا (Neo-Sufis) نے' جیسا کہ ان مصلحین کو کہا جاتا ہے۔ الجیریا اور مدینہ میں یہی مشن پورے کیے۔ محمد بن علی السنوسی (وفات 1832ء) نے سنوسیہ تحریک کی بنیاد رکھی جو اب بھی لیبیا میں اسلام کی غالب شکل ہے۔ نئے صوفیوں کو نہ تو نئے مغرب میں دلچسپی تھی نہ اس کا علم تاہم انہوں نے اپنی صوفیانہ روایات کے ذریعے ویسے ہی نظریات تشکیل دیئے جیسے یورپ میں روشن خیالی کے دور میں وضع ہوئے تھے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ لوگوں کو اپنی بصیرتوں پر ہی اعتبار کرنا چاہیے اور علماء پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ ابن ادریس تو اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ کے علاوہ کسی بھی مسلمان مفکر کو سند تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو باہمی اختلافات ترک کرنے کی تاکید کی اور ماضی کی روایات سے چمٹے رہنے کی بجائے نئے خیالات کو قبول کرنے کی ہدایت کی۔ ان کے تصوف کی بنیاد رسول کریم ﷺ کی شخصیت ہے اور انہوں نے ایک قسم کی انسان دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے لوگوں کو درس دیا کہ وہ دوردراز کے خدا کی آرزو کرنے کی بجائے خود کو ایک مثالی انسان کے سانچے میں ڈھالیں۔

چنانچہ کوئی معقول وجہ نہیں تھی کہ مسلمان نئے یورپ کے نظام حکومت و معاشرت کو مسترد کرتے۔ صدیوں کے عرصے میں انہوں نے ایسے خیر کے کام کیے تھے جو جدید مغرب کے لیے بھی اہم تھے ــــ یعنی معاشرتی انصاف کی لگن' ایک مساویانہ نظام' اظہار کی آزادی اور

توحید کے مثالیئے کے باوجود ایک حقیقی (یا شیعیت کی صورت میں) مذہب اور سیاست کی اصولی علیحدگی۔ تاہم اٹھارہویں صدی کے اختتام تک انتہائی چوکس مسلمان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ یورپ ان پر غالب آچکا ہے۔ عثمانیوں نے اوائل میں یورپی طاقتوں کو زبردست شکستوں سے دوچار کیا تھا مگر اٹھارہویں صدی تک وہ نہ تو ان کا سامنا کرنے کے اہل رہے تھے اور نہ ہی ان سے برابری کی حیثیت میں معاملہ کرنے کے قابل تھے۔ سولہویں صدی میں سلیمان نے یورپی تاجروں کو سفارتی تحفظ فراہم کیا۔

ان معاہدوں کو ''خصوصی مراعات'' کہا جاتا ہے' اس کے تحت ان یورپی تاجروں کو' جو عثمانیوں کے علاقے میں رہتے تھے' ملک کے قانون کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔ ان کے جرائم پر انہی کے قوانین کے تحت انہی کی عدالتوں میں مقدمات چلائے جاتے تھے جن میں یورپی وکلاء ہی پیش ہوا کرتے تھے۔ سلیمان نے یورپی اقوام کے ساتھ برابری کی سطح پر یہ معاہدات کیے تھے۔ تاہم اٹھارہویں صدی تک یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ مراعات عثمانی سلطنت کو کمزور کر رہی ہیں۔ یہ امر اس وقت خصوصی طور پر واضح ہوگیا جب 1740ء میں عیسائیوں کو سلطنت میں یورپی نقل مکانی کرنے والوں کی طرح ''تحفظ'' فراہم کیا گیا جو حکومت کے کنٹرول میں مزید نہیں رہے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر تک عثمانی سلطنت کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ تجارت میں مزید زوال آ گیا' عرب صوبوں کے بدو قبائل قابو سے باہر ہوگئے اور مقامی پاشا' جو استنبول کے مزید تابع فرمان نہیں رہے تھے' بدعنوان ہوگئے اور رعایا کا استحصال کرنے لگے۔ اُدھر مغرب یکے بعد دیگرے فتوحات حاصل کرتا جارہا تھا۔ اس کے باوجود عثمانیوں کو غیر ضروری فکر لاحق نہیں ہوئی تھی۔ سلطان سلیم سوم نے یورپ کی کتاب سے ایک ورق مستعار لینے کی کوشش کی' اس نے یہ فرض کرلیا تھا کہ مغربی خطوط پر عسکری اصلاحات طاقت کے توازن کو بحال کردیں گی۔ 1789ء میں اس نے عسکری سکول کھولے اور ان میں فرانسیسی اتالیق مقرر کیے۔ ان سکولوں میں طلبہ کو جدید عسکری فنون کے ساتھ ساتھ یورپی زبانیں اور نئے مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ لیکن مغربی خطرے کو روکنے کے لیے یہ اقدامات اطمینان بخش نہیں تھے۔ مسلمانوں نے ہنوز اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا تھا کہ یورپ ایک بالکل مختلف قسم کا معاشرہ تشکیل کرچکا ہے۔ وہ اسلامی سلطنتوں سے بہت آگے نکل چکا تھا اور جلد ہی عالمی طاقت بن جانے والا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر تک تینوں عظیم سلطنتیں زوال پذیر ہوچکی تھیں ۔ یہ

اسلام کی جوہری نااہلی یا بدقسمتی نہیں تھی جیسا کہ یورپی اکثر تکبر کے ساتھ سوچتے ہیں۔ ہر زرعی معاشرے کا دورِحیات محدود ہی ہوا کرتا ہے اور یہ مسلمان ریاستیں' جوکہ زرعی معاشرے کا آخری مثالی نمونہ تھیں' اپنے فطری اور ناگزیر انجام سے دوچار تھیں۔ جدید دور سے پہلے خود مغربی اور عیسائی طاقتیں بھی اسی طرح کے زوال سے گزر چکی تھیں۔اس سے پہلے بھی مسلمان ریاستیں زوال کا شکار ہوچکی تھیں اور ہر مرتبہ مسلمان ققنس کی طرح خاک سے اٹھ کر آسمان تک پہنچ گئے تھے اور عظیم ترین کارنامے سرانجام دیتے رہے تھے۔تاہم اس مرتبہ معاملہ مختلف تھا۔ اٹھارہویں صدی میں مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ہی مغرب میں ایک بالکل مختلف انداز کی تہذیب ابھر رہی تھی اور اس مرتبہ اسلامی دنیا کو اس چیلنج کا سامنا کرنا دشوار ہورہا تھا۔

حصہ پنجم

الم زدہ اسلام

مغرب کی آمد

(1750ء۔ 2000ء)

تاریخ میں مغرب کے عروج کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ الپس کے شمال میں واقع ملکوں کو صدیوں تک پسماندہ خطہ تصور کیا جاتا رہا تھا' جس نے خود کو جنوب کی یونانی رومی ثقافت سے منسلک کر رکھا تھا اور بتدریج عیسائیت کا اپنا منفرد روپ اور زرعی ثقافت کی اپنی صورت وضع کرلی تھی۔ مغرب بازنطین کی عیسائی سلطنت کی پیروی کر رہا تھا جہاں یورپ کی طرح رومی سلطنت منہدم نہیں ہوئی تھی۔ بارہویں اور تیرہویں صدی تک یہ مغربی یورپی ملک دوسری مرکزی ثقافتوں کے خوشہ چیں رہے اور سولہویں صدی تک عظیم قلبِ ماہیت کا عمل شروع ہوگیا جس نے مغرب کو باقی دنیا پر غالب آنے کے قابل بنا دیا۔ کسی پچھڑی ہوئی قوم کا یوں عروج پا لینا ایک منفرد واقعہ تھا۔ یہ عمل ساتویں اور آٹھویں صدی میں عرب مسلمانوں کے ایک بڑی عالمی طاقت کے طور پر ظہور پذیر ہونے کے مماثل تھا۔ تاہم مسلمانوں نے عالمی اجارہ داری حاصل نہیں کی تھی اور نہ ہی نئی قسم کی تہذیب تشکیل دی تھی۔ جبکہ یورپ نے سولہویں صدی میں اس عمل کا آغاز کر دیا تھا۔ جب عثمانیوں نے یورپ سے اٹھنے والے خطرے سے نمٹنے کی امید میں اپنی فوج کی مغربی خطوط پر تنظیم نو کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ ناکام ہوگئے تھے کیونکہ وہ بہت سطحی کوشش تھی۔ ایک روایتی زرعی معاشرے کے لیے یورپ کو اسی کے میدان میں پچھاڑنے کے واسطے ضروری تھا کہ وہ اوپر سے نیچے تک خود میں تبدیلی لائے اور اپنے معاشرتی' معاشی' تعلیمی' مذہبی' روحانی' سیاسی اور دانش ورانہ ڈھانچوں (Structures) کو دوبارہ تخلیق کرے۔ جبکہ انہیں یہ سب کچھ بہت جلدی کرنا تھا اور یہی ناممکن تھا کیونکہ یورپ کو یہ کامیابی حاصل کرنے میں تین سو سال کا عرصہ لگا تھا۔

یورپ اور اس کی امریکی نوآبادیوں کا معاشرہ بالکل مختلف معاشی بنیادوں پر استوار

تھا۔ اضافی زرعی پیداوار پر انحصار کرنے کی بجائے اس کی بنیاد ٹیکنالوجی اور سرمایہ کاری تھی جس نے مغرب کو اپنے وسائل میں لامحدود اضافے کے قابل بنا دیا اس طرح مغربی معاشرہ زرعی کلچر کی محدودیتوں کا مزید شکار نہیں رہا۔ یہ ایک عظیم انقلاب تھا جو بیک وقت سیاسی' سماجی اور دانش ورانہ محاذوں پر برپا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی پیشگی منصوبہ نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ تو ایک ایسے پیچیدہ عمل کا نتیجہ تھا جو جمہوری' سیکولر' سماجی ڈھانچوں کی تخلیق کا پیش خیمہ بنا تھا۔ سولہویں صدی تک یورپیوں نے ایک ایسا سائنسی انقلاب برپا کر دیا تھا جس نے انہیں ماحول پر وہ گرفت عطا کی جو پہلے کبھی کسی کو حاصل نہیں ہوئی تھی۔ طب' جہازرانی' زراعت اور صنعت کے میدانوں میں نئی نئی دریافتیں ہو چکی تھیں۔ یہ دریافتیں حتمی نہیں تھیں بلکہ انہوں نے مزید دریافتوں کی راہیں کشادہ کیں۔ 1600ء تک ایجادات اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہی تھیں کہ ترقی کا عمل آگے ہی آگے بڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک میدان میں ہونے والی دریافت دوسرے میدان میں ایجادات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی۔ دنیا کو ناقابل تغیر قوانین کے ذریعے چلنے والی تصور کرنے کی بجائے یورپیوں نے محسوس کیا کہ وہ فطرت کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ جہاں زرعی ثقافت کا تخلیق کردہ روایت پسند معاشرہ اس طرح کی تبدیلی کا متحمل نہیں تھا وہاں یورپ اور امریکہ کے لوگ زیادہ پراعتماد ہوتے جا رہے تھے۔ وہ مسلسل ترقی اور تجارت میں متواتر بہتری کی پختہ توقع کے ساتھ سرمائے کو کاروبار میں لگانے پر آمادہ تھے۔ معاشرے میں ٹیکنالوجی کے اس فروغ کا نتیجہ انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مغرب کے لوگ اس قدر مطمئن اور احساس تحفظ کے حامل تھے کہ وہ زرعی معاشرے اور مذاہب کی طرح ہدایت کے لیے ماضی کی طرف نہیں دیکھتے تھے بلکہ مستقبل میں جھانکنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

معاشرے کی جدیدیت پذیری کا مطلب سماجی اور دانشورانہ تبدیلی ہوتا ہے۔ اہلیت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی' ہر ایجاد یا نظام کے عملی طور پر مؤثر ہونے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ مختلف سائنسی اور صنعتی پروجیکٹوں میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نچلے درجوں میں کام کرنے کی ضرورت تھی ـــ مثلاً چھپائی کرنے والے (پرنٹرز)' کلرک' کارخانوں میں کام کرنے والے ـــ اور نئے معیارات پر پورا اترنے کے لیے انہیں کسی نہ کسی قسم کی تعلیم حاصل کرنا ہوتی تھی۔ معیشت کو اس قدر استحکام دینے کے لیے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد خوشحال ہو ضرورت اس امر کی تھی کہ وسیع پیمانے پر پیدا ہونے والی اشیاء کے خریدار بھی

ہوں۔ چونکہ زیادہ محنت کش تعلیم یافتہ ہوگئے تھے اس لیے انہوں نے حکومت کے فیصلوں میں زیادہ شرکت کا مطالبہ کیا۔ اگر کوئی قوم اپنے تمام انسانی وسائل کو استعمال کرنا چاہتی تو اس کے لیے ضروری تھا کہ اب تک محدود رکھے گئے یہودیوں جیسے گروہوں کو ثقافت کے مرکزی دھارے میں شامل کرے۔ مذہبی اختلافات اور روحانی آدرشوں کو ترقی میں رکاوٹ ڈالنے سے روکنا لازم تھا اور سائنس دانوں' بادشاہوں اور حکومتی اہل کاروں کو مذہبی پیشوائیت سے نجات پانا تھی۔ اس طرح جمہوریت' تکثیریت' رواداری' انسانی حقوق اور سیکولرازم کے آدرش سیاسی سائنس دانوں کے خوبصورت خواب نہیں تھے بلکہ جدید ریاست کے تقاضوں سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ محسوس کیا گیا کہ ایک جدید قوم کو فعال اور پیداواری بننے کے لیے سیکولر جمہوری بنیادوں پر منظم ہونا ہوگا اور اس حقیقت کا بھی ادراک کیا گیا کہ اگر معاشرے اپنے تمام اداروں کو عقلی اور سائنسی اصولوں کے مطابق منظم کرلیں تو وہ ناقابل تسخیر ہوجائیں گے اور روایت پسندانہ زرعی ریاستیں ان کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔

اسلامی دنیا کے لیے اس کے نتائج بہت برے تھے۔ جدید معاشرے اور صنعتی معیشت کی ترقی پذیر فطرت میں شامل تھا کہ وہ مسلسل توسیع پاتی رہے۔ نئی منڈیوں کی ضرورت تھی اور جب ملکی منڈیاں ناکافی ہونے لگیں تو انہیں دوسرے ملکوں میں منڈیاں تلاش کرنا پڑیں۔ چنانچہ مغربی ریاستوں نے جدید یورپ سے باہر واقع زرعی ملکوں کو اپنے تجارتی جال (نیٹ ورک) میں لانے کے لیے انہیں مختلف طریقوں سے نوآبادیاں بنانا شروع کردیا۔ یہ بھی ایک پیچیدہ عمل تھا۔ نوآبادیاتی ملک برآمد کرنے کے لیے خام مال مہیا کرتا جو یورپی صنعتوں میں کھپا دیا جاتا تھا۔ اس کے بدلے میں اُسے سستی تیار شدہ مغربی اشیاء حاصل ہوتیں' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی صنعت عموماً تباہ و برباد ہوگئی۔ نوآبادی کو یورپی خطوط پر تبدیل اور جدید ہونا پڑتا تھا۔ اس کی مالی اور تجارتی حیات کو عقلیت پسندانہ ہونا اور مغربی نظام میں ڈھلنا پڑتا اور کم از کم کچھ "مقامیوں" کو جدید تصورات اور اخلاقیات سے واقفیت حاصل کرنا پڑتی۔

نوآبادیاتی نظام کو زرعی نوآبادیوں نے تخریبی' پریشان کن اور اجنبی پایا۔ چونکہ یورپ جس عمل سے تین صدیوں میں گزرا تھا اسے نہایت تیز رفتاری سے حاصل کیا گیا اس لیے جدیدیت پذیری ناگزیر طور پر سطحی ہوگئی تھی۔ جہاں یورپ میں جدید تصورات کافی عرصے میں بتدریج معاشرے کے تمام طبقوں میں رائج ہوئے تھے وہاں نوآبادیوں میں بالائی

طبقات — خاص طور پر فوج سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی قلیل تعداد مغربی تعلیم حاصل کر سکی اور جدیدیت کی حرکیت کی مدح خواں بن سکی۔ آبادی کی اکثریت کو قدیم زرعی نظام معاشرت کی دلدل میں ہی رہنے دیا گیا۔ چنانچہ معاشرہ منقسم ہوگیا اور بتدریج دونوں فریقین ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر ہو گئے۔ جو لوگ جدیدیت پذیری کے عمل سے باہر رہ گئے تھے وہ اپنے ملک کو بالکل اجنبی ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے جس طرح کوئی دوست بیماری کی وجہ سے اپنے نقش و نگار گنوا دے اور ناقابل شناخت ہوجائے۔ ان پر سیکولر غیر ملکی قانون کے ذریعے حکومت کی جارہی تھی جو کہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ ان کے شہروں کی قلبِ ماہیئت ہوگئی تھی۔ مغربی عمارتوں نے شہروں کو ''جدید'' بنایا تو اکثر و بیشتر ''پرانا شہر'' ایک عجائب گھر' سیاحوں کی سیر کا مقام اور گئے گزرے زمانوں کی یادگار بن کر رہ گیا۔ مغربی سیاح اکثر و بیشتر محسوس کرتے کہ مشرقی شہروں کی بل کھاتی ہوئی گلیوں اور ظاہرہ انتشار میں وہ اکثر و بیشتر حواس باختہ ہوجاتے ہیں اور راستہ بھول جاتے حالانکہ وہ کبھی ایسا نہیں سوچتے تھے کہ بیشتر مقامی آبادی کے لیے ان کے جدید دارالحکومت بھی اسی طرح ہی اوپرے (Alien) ہیں۔ لوگوں نے اپنے ہی ملکوں کے اندر خود کو کھویا ہوا پایا۔ سب سے بڑھ کر معاشرے کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے مقامی افراد نے اس حقیقت پر غم و غصے کا اظہار کیا کہ وہ اپنی تقدیر کے خود مالک نہیں رہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی جڑوں سے کٹ گئے ہیں اور اپنے تشخص کو گنوا رہے ہیں۔

جہاں یورپیوں اور امریکنوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے جدیدیت اپنائیں اور اپنے ذاتی مقاصد کو پورا کریں وہاں نو آبادیوں کے لوگوں کو بہت تیزی سے جدید ہونا پڑا اور انہیں کسی دوسرے کے پروگرام پر عمل کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ ادھر خود مغربی لوگوں نے اپنے معاشرے کی تبدیلی کو کرب انگیز پایا تھا۔ انہوں نے قریباً چار سو سال سیاسی اور اکثر و بیشتر خونیں انقلابات' دہشت کی حکمرانی' نسل کشی' مذہبی جنگوں' دیہی علاقوں کی غارت گری' وسیع سماجی ابھاروں' کارخانوں میں استحصال' روحانی اضطراب اور نئے عظیم تر شہروں (Megacities) میں عمیق اجنبیت کا تجربہ کیا تھا۔ آج ہم ترقی پذیر ملکوں میں ویسا ہی تشدد' ظلم و ستم' انقلابات اور بے جہتی کا مشاہدہ کر رہے ہیں' جو جدیدیت کی طرف ایک زیادہ دشوار سفر کی نشانی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مغرب میں پیدا ہونے والی جدید روح بنیادی طور پر مختلف ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اس کی دو خصوصیات ہیں: ایجاد پسندی اور خود مختاری (یورپ اور

امریکہ میں جدیدیت کے عمل کو سیاسی' دانشورانہ' مذہبی اور سماجی محاذوں پر آزادی کے اعلامیوں نے تیز کیا تھا) لیکن ترقی پذیر دنیا میں جدیدیت خودمختاری کے ساتھ نہیں آئی بلکہ آزادی اور قومی خودمختاری کے ضیاع کے ذریعے آئی۔ ترقی پذیر ملک ایجاد پسندی کی بجائے مغرب کی صرف نقالی کر کے جدید ہو سکتے ہیں' جو کہ اتنا ترقی کر گیا ہے کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے۔ چونکہ جدیدیت پذیری کا عمل یکساں نہیں رہا اس لیے لازمی نہیں کہ نتیجہ وہی نکلے جو مغرب کو مطلوب ہو۔ اگر کیک کی تیاری کے لیے ٹھیک اجزاء دستیاب نہ ہوں ـــ اگر آٹے کی بجائے چاول' تازہ کی جگہ خراب انڈے اور چینی کی بجائے گرم مصالحے استعمال کیے جائیں ـــ تو نتیجہ پکوانوں کی کتاب میں بیان کیے گئے کیک سے مختلف ہوگا۔ نوآبادیوں کے جدید کیک میں مختلف اجزاء استعمال کیے گئے ہیں اور جمہوریت' سیکولرازم' تکثیریت وغیرہ مغرب کے سے انداز میں ظہور پذیر نہیں ہوئے۔

اسلامی دنیا کو جدیدیت نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسلامی دنیا عالمی تہذیبوں کا ایک رہنما ہونے کی بجائے یورپی طاقتوں کی طفیلی بن کر رہ گئی۔ نوآبادیاتی طاقتوں نے مسلمانوں کی توہین کی۔ وہ مسلمان معاشرے کو پسماندہ' نااہل اور بدعنوان سمجھتے تھے۔ انہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ یورپی ثقافت ہمیشہ ترقی پسند رہی ہے۔ ان میں اس تاریخی تناظر کی کمی تھی کہ وہ یہ سوچتے کہ وہ تو ایک جدیدیت سے پہلے کے زرعی معاشرے کا مشاہدہ کر رہے تھے اور چند ہی صدیاں پہلے یورپ بھی اسی طرح ''پسماندہ'' تھا۔ وہ مغربیوں کو ''مشرقیوں'' سے پیدائشی اور نسلی اعتبار سے برتر تصور کرتے تھے اور بے شمار طریقوں سے ان کی توہین کرتے تھے۔ یہ سب غیر فطری بھی نہیں تھا۔ مسلمانوں نے مغربی ثقافت کے خلاف جس عداوت اور غصے کا اظہار کیا اس نے مغرب کے لوگوں کو پریشان کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے مختلف تجربے کی وجہ سے وہ تو مغربی ثقافت کو آزادی اور قوت عطا کرنے والی ثقافت سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کا ردعمل عجیب نہیں تھا کیونکہ اسلامی دنیا بہت وسیع اور سٹرٹیجک حوالے سے اہم مقامات پر محیط تھی۔ اس کو مشرق وسطیٰ' ہندوستان' عرب' ملائیشیا اور افریقہ کے خاصے حصے پر محیط متحدہ نوآبادیاتی عمل کے ذریعے سب سے پہلے محکوم بنایا گیا تھا۔ ان تمام مقامات کے مسلمانوں نے بہت ابتدا ہی میں جدیدیت پذیری کے اس عمل کی شدت کو بھانپ لیا تھا۔ ان کا ردعمل محض مغرب کا محض ردعمل ہی نہیں تھا بلکہ نظریاتی ردعمل تھا۔ وہ جاپان کی طرح کامیابی سے اور سکون کے ساتھ جدیدیت اپنانے سے قاصر رہے۔ جاپان کبھی نوآبادی نہیں بنایا گیا' اس کے

معاشی ادارے مستحکم رہے اور وہ مغرب کا طفیلی بننے پر بھی مجبور نہیں ہوا۔

اسلامی دنیا پر یورپ کی یورش بھرپور اور مؤثر تھی۔ یہ مغل ہندوستان سے شروع ہوئی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آخری نصف میں برطانوی تاجروں نے بنگال میں مضبوطی حاصل کرلی تھی اور اس وقت جبکہ جدیدیت اپنی طفولیت میں ہی تھی تو برطانوی تاجر ہندو اور مسلمان تاجروں کے ساتھ مساویانہ طور پر رہتے تھے۔ تاہم برطانوی تجارت کے اس مرحلے کو ''بنگال کی لوٹ مار'' کہا گیا ہے کیونکہ اس نے مقامی صنعت کو نقصان پہنچایا اور اس کی زراعت کو بدل دیا تاکہ بنگالی اپنے لیے فصلیں اگانے کی بجائے مغربی صنعتی منڈیوں کے لیے خام مال پیدا کریں۔ عالمی معیشت میں بنگال دوسرے درجے تک گھٹ گیا تھا۔ جوں جوں برطانوی بتدریج زیادہ ''جدید'' اور اہل ہوتے گئے ان کا رویہ مزید برتری والا ہوتا گیا اور انہوں نے ہندوستانیوں کو ''مہذب'' بنانے کا تہیہ کرلیا۔ پروٹسٹنٹ مشنریوں نے ان کی پشت پناہی کی' جو 1793ء میں وہاں آنا شروع ہوئے تھے۔ مکمل طور پر صنعتی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے بنگالیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

برطانوی حکمرانوں نے جدید ٹیکنالوجی کے وہی پہلو متعارف کروائے جو ان کی برتری کو منواتے اور بنگال کو طفیلی کردار ادا کرتے رہنے تک محدود رکھتے۔ برطانویوں نے بنگالیوں کو یہ فائدہ ضرور پہنچایا کہ وباؤں' قحط اور جنگ جیسی تباہیوں سے انہیں محفوظ رکھا اور اس کے نتیجے میں آبادی بڑھ گئی۔ جس سے آبادی کی کثرت اور غربت جیسے مسائل پیدا ہوگئے کیونکہ مغرب کی طرح یہاں شہروں کو نقل مکانی کر جانے جیسا کوئی متبادل نہیں تھا اور سب لوگوں کو دیہاتوں میں ہی رہنا پڑتا تھا۔

بنگال کی معاشی حوالے سے لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے 1798ء سے 1818ء کے دوران اس پر سیاسی غلبے کی راہیں کشادہ ہوئیں۔ برطانوی اقتدار معاہدوں اور فوجوں کے ذریعے پورے ہندوستان پر قائم ہوگیا' سوائے وادیٔ سندھ کے' جس پر 1843ء سے 1849ء کے دوران قبضہ جمایا گیا۔ اسی عرصے کے دوران فرانسیسی اپنی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ 1798ء میں نپولین بوناپارٹ نے مصر پر قبضہ کرلیا۔ وہ سوئز میں ایک مرکز قائم کرکے برطانویوں کے ہندوستان کو جانے والے بحری راستوں کو بند کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ عالموں کا ایک جتھا' جدید یورپی ادب کی ایک لائبریری' ایک سائنسی لیبارٹری اور عربی ٹائپ والا چھاپہ خانہ لے آیا۔ ابتداء میں تو ایک انتہائی اعلیٰ کارکردگی والی فوج کے ساتھ ترقی

یافتہ یورپی ثقافت کی آمد کو مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں نے ایک جارحیت تصور کیا۔ نپولین کی مصر اور شام کی مہمات ناکام ہوگئیں۔ وہ روس کی مدد سے برطانوی ہندوستان پر شمال سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اس سے ایران کو ایک بالکل نئی سٹرٹیجک اہمیت حاصل ہوگئی اور اگلی صدی کے دوران برطانیہ نے ملک کے جنوب میں ایک مرکز قائم کیے رکھا جبکہ روسی شمال پر کنٹرول قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دونوں طاقتیں ایران کو مکمل طور پر اپنی نوآبادی نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ (تاوقتیکہ بیسویں صدی کے اوائل میں تیل دریافت نہیں ہوگیا) تاہم دونوں نے نئی قاچار حکومت کو مغلوب کرلیا تاکہ شاہ کم از کم دونوں میں سے ایک طاقت کی تائید وحمایت کے بغیر کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت نہ کرے۔ بنگال کی طرح برطانیہ اور روس دونوں نے صرف ایسی ٹیکنالوجی کو فروغ دیا جو خود ان کے مفاد میں تھی اور ریلوے جیسی اختراعات کو مروج نہیں کیا جو کہ ایرانی عوام کو فائدہ پہنچا سکتی تھیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انہیں اپنی سٹرٹیجک پوزیشن کو خطرہ لاحق ہونے کا ڈر تھا۔

یورپی طاقتیں یکے بعد دیگرے اسلامی ملکوں کو اپنی نوآبادی بناتی چلی گئیں۔ فرانس نے 1830ء میں الجیریا پر قبضہ کرلیا جبکہ نو برس بعد برطانیہ نے عدن پر قبضہ کرلیا۔ تیونس پر 1881ء میں' مصر پر 1882ء میں' سوڈان پر 1889ء میں اور لیبیا اور مراکش پر 1912ء میں قبضہ کیا گیا۔ 1915ء میں سائیکس پائیکاٹ معاہدے نے قریب المرگ عثمانی سلطنت کو (جس نے پہلی عالمی جنگ میں جرمنی کا ساتھ دیا تھا) فتح کی توقع کرنے والے برطانیہ اور فرانس کے درمیان تقسیم کردیا۔ جنگ کے بعد برطانیہ اور فرانس نے شام' لبنان' فلسطین' عراق اور اردن پر انتداب قائم کرلیا یا ممالکِ محروسہ بنالیا۔ چونکہ یورپی طاقتوں نے عثمانی سلطنت کے عرب صوبہ جات سے آزادی کے وعدے کیے تھے اس لیے اس اقدام کو وعدہ خلافی تصور کیا گیا۔ عثمانی سلطنت کے قلب میں مصطفیٰ کمال' جو اتاترک کے نام سے مشہور ہے (1938ء۔1881ء)' یورپیوں کو دور رکھنے میں کامیاب ہوا اور اس نے ترکی کی آزاد ریاست قائم کی۔ بلقان' روس اور وسطی ایشیا کے مسلمان نئی سوویت یونین کی رعایا بن گئے۔ ان میں سے چند ملکوں کو آزادی دینے کے بعد بھی مغرب نے ان کی معیشت پر گرفت برقرار رکھی' تیل اور نہر سوئز جیسے وسائل پر قبضہ جاری رکھا۔ یورپی قابضین کا ورثہ اکثر وبیشتر کسی تلخ تنازعے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جب 1947ء میں برطانوی ہندوستان سے نکلے تو برصغیر کو ہندو انڈیا اور مسلم پاکستان میں تقسیم کردیا گیا' جو آج تک ایک دوسرے کے دارالحکومتوں کو ایٹمی

ہتھیاروں کے نشانے پر رکھے ہلاکت انگیز عداوت کی حالت میں ہیں۔ 1948ء میں فلسطین کے عرب صیہونیوں کے ہاتھوں اپنی مادر وطن گنوا بیٹھے' جنہوں نے اقوام متحدہ اور بین الاقوامی برادری کی تائید وحمایت سے اسرائیل کی سیکولر ریاست قائم کرلی۔ فلسطین کا چھینا جانا مغربی طاقتوں کے ہاتھوں اسلامی دنیا کی تذلیل کی ایک علامت بن گیا' جس کا ضمیر لاکھوں فلسطینیوں کی مستقل بے وطنی پر ذرا بھی ملامت کرتا دکھائی نہیں دیتا۔

اس کے باوجود بالکل ابتدائی زمانے میں کچھ مسلمان مغرب کی محبت میں مبتلا تھے۔ ایرانی دانشوروں ملکوم خان (1908ء۔ 1833ء) اور آقا خان کرمانی (96-1853ء) نے ایرانیوں کو تاکید کی کہ مغربی تعلیم حاصل کریں اور شریعت کی جگہ ایک جدید سیکولر قانونی نظام اپنائیں کیونکہ ترقی کا واحد راستہ یہی ہے۔ انہی حلقوں کے سیکولر لوگوں نے 1906ء کے نسبتاً زیادہ لبرل علماء کے آئینی انقلاب میں حصہ لیا اور قاچاروں کو ایک جدید آئین نافذ کرنے' بادشاہ کے اختیارات کو محدود کرنے اور ایرانی عوام کو پارلیمانی نمائندگی دینے پر مجبور کیا۔ نجف کے بیشتر مجتہدوں نے آئین کی حمایت کی۔ شیخ محمد حسین نائینی نے اپنی کتاب ''قوم کے لیے نصیحت'' (1909ء) میں اپنے خیالات کا واضح طور پر اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جبر واستبداد کو اس طریقے سے محدود کرنا شیعہ اصولوں کے عین مطابق ہے اور مغربی طرز کی آئینی حکومت امام غائب کی واپسی کے عقیدے کے بعد دوسری بہترین چیز ہے۔ مصر کے ادیب رفاح التحتوی (73-1801ء) کو یورپی روشن خیالی کے دور کے تصورات نے مسحور کردیا تھا' جس کا وژن انہیں ''فلسفہ'' کی یاد دلا دیتا تھا۔ وہ فرانسیسی ثقافت سے بہت متاثر تھے' عام آدمی کو بھی تعلیم دلوانا چاہتے تھے اور ایجاد واختراع کے عمل کو عام کرنے کے خواہاں تھے۔ وہ مصر کو اس نئی بہادر دنیا (New Brave World) میں داخل کرنے کے آرزومند تھے۔ ہندوستان میں سید احمد خان (98-1817ء) نے اسلام کو جدید مغربی لبرل ازم سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جدید سائنس جو قوانین فطرت دریافت کررہی ہے وہ قرآن کے عین مطابق ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا جہاں مسلمان روایتی اسلامی مضامین کے ساتھ ساتھ سائنس اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرسکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان برطانویوں کی نقالی کرنے کی بجائے اپنے تہذیبی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے جدید معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے اہل ہوجائیں۔

ان ملکوں میں سے چند کے حکمرانوں نے نوآبادی بننے سے پیشتر جدیدیت کو

اپنانے کی کوششیں کی تھیں۔ عثمانی سلطان محمد دوم نے 1826ء میں ''تنظیمات'' کے نام سے اصلاحات کے عمل کا آغاز کیا۔ اُس نے ینی چریوں کو ختم کر کے فوج کو جدید سانچے میں ڈھالا اور نئی ٹیکنالوجی کو متعارف کروایا۔ 1839ء میں سلطان عبدالحمید نے گولین فرمان کا اجراء کیا جس کے تحت اس کے اقتدار کا دارومدار عوام کے ساتھ ایک معاہداتی تعلق پر ہوگیا۔ اس نے سلطنت کے اداروں میں اہم اصلاحات کیں۔ تاہم جدیدیت کا زیادہ ڈرامائی پروگرام مصر کے محمد علی پاشا (1848ء - 1769ء) کا تھا' جس نے مصر کو استنبول سے حقیقتاً آزاد کروا دیا اور تن تنہا اس پسماندہ صوبے کو جدید دنیا میں شامل کیا لیکن اس کے طریقہ کار کی سفاکی نے ظاہر کر دیا کہ اس جان لیوا (Breakneck) رفتار کے ساتھ جدیدیت کو اپنانا کتنا دشوار ہے۔ اس نے اپنے سیاسی مخالفوں کا قتل عام کروایا۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کے آب پاشی کے نظام کی بہتری کے لیے لی جانے والی جبری مزدوری کے نتیجے میں تیئس ہزار کسان ہلاک ہو گئے۔ دیگر کسان محمد علی کی جدید فوج میں جبری بھرتی سے خوفزدہ ہو کر اپنے اعضاء کاٹنے لگے' بعض نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں اور بعض نے اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔ ملک کو سیکولر بنانے کے لیے محمد علی نے مذہبی طور پر وقف شدہ جائیدادوں کو ضبط کر لیا۔ ایک منظم طریقے سے علماء کو محدود کر دیا اور ان سے ہر طرح کے اختیارات واپس لے لیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جدیدیت کو ایک صدمہ انگیز مہم سمجھنے والے علماء زیادہ تنگ نظر ہو گئے اور انہوں نے اپنے ملک میں وجود پذیر ہوتی ہوئی نئی دنیا پر اپنے ذہنوں کے دریچے بند کر لیے۔ محمد علی کا پوتا اسمٰعیل پاشا (1803-95ء) کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ اس نے نہر سوئز تعمیر کروائی' نو سو میل لمبی ریل کی پٹڑی بچھوائی' اب تک غیر مزروعہ چلی آ رہی تیرہ لاکھ تہتر ہزار ایکڑ اراضی کو زیر کاشت لایا گیا' لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جدید سکول کھولے گئے اور قاہرہ کو ایک جدید شہر بنا دیا گیا۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس پروگرام کی وجہ سے مصر دیوالیہ ہو گیا' اسے قرض لینے پر مجبور ہونا پڑا اور برطانیہ کو چھوٹ دی گئی کہ وہ 1882ء میں یورپی حصہ داروں (شیئر ہولڈرز) کے مفادات کے تحفظ کی خاطر عسکری تسلط قائم کر لے۔ محمد علی اور اسمٰعیل مصر کو ایک جدید آزاد ریاست بنانے کے خواہشمند تھے۔ اس کے بجائے جدیدیت پذیری کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حقیقتاً برطانوی نو آبادی بن گیا۔

ان اولین مصلحین میں سے کسی نے بھی یورپی قلبِ ماہیئت کے پس پردہ تصورات کو نہیں اپنایا۔ اسی وجہ سے ان کی اصلاحات سطحی ثابت ہوئیں۔ لیکن بعد میں آنے والے

مصلحین نے، بشمول صدام حسین، جدید مغرب کی عسکری ٹیکنالوجی کو حاصل کرنے کی کوشش تو کی لیکن باقی معاشرے پر اس کے بہت زیادہ اثرات میں کوئی دلچسپی نہیں لی تاہم کچھ مصلحین شروع سے ہی ان خطرات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ خطرے کی گھنٹی سننے والوں میں سے پہلے شخص ایرانی مصلح جمال الدین (97-1839ء) تھے، خودکو ''الافغانی'' کہلاتے تھے۔ شاید انہیں یہ امید رہی ہو کہ ایک ایرانی شیعہ کی بجائے ایک افغانی سنی کی حیثیت میں وہ اسلامی دنیا کے لیے زیادہ کشش انگیز ثابت ہوسکتے ہیں۔ وہ 1857ء میں برطانوی راج کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کی عظیم بغاوت کے موقع پر ہندوستان میں موجود تھے۔ وہ عرب، مصر، ترکی، روس یا یورپ جہاں کہیں بھی گئے انہوں نے مغرب کی بے انتہا طاقت کا مشاہدہ کیا اور انہیں یقین ہوگیا کہ مغرب جلد ہی اسلامی دنیا پر غالب آجائے گا اور اسے کچل دے گا۔ وہ مغربی زندگی کی کھوکھلی نقالی کے خطرات کا مشاہدہ کرسکتے تھے۔ انہوں نے یورپی خطرے کے خلاف اسلامی دنیا کے لوگوں کو متحد ہو جانے کی تلقین کی۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو نئی دنیا کی سائنسی ثقافت کو اپنی شرائط پر لازماً اپنا لینا چاہیے۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنی ثقافتی روایات کو ترویج دینی چاہیے اور اس کا مطلب تھا اسلام کو ترویج دینی چاہیے لیکن خود اسلام کو بدلے ہوئے حالات کا حل لازماً پیش کرنا اور زیادہ عقلیت پسندانہ اور جدید بننا ہوگا۔ مسلمانوں کو اجتہاد کے مدت دراز سے بند دروازوں کو کھولنا ہوگا اور رسول کریم ﷺ اور قرآن دونوں کی ہدایت کے مطابق اپنی آزاد عقل کو استعمال کرنا ہوگا۔

مغرب کے اس اثر و نفوذ کی وجہ سے سیاست کو اسلام میں دوبارہ مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ رسول کریم ﷺ کے زمانے سے مسلمان اپنے وقت کے موجودہ حالات و واقعات کو الوہی اقدامات تصور کرتے تھے۔ وہ خدا کو تاریخ میں موجود مانتے تھے، جو دنیا کو بہتر بنانے کے لیے چیلنج پیش کرتا رہتا تھا۔ مسلمانوں نے سیاسی واقعات میں ایک الوہی معنویت پائی اور ان کی ناکامیوں اور المیوں تک نے الٰہیات اور روحانیات میں اہم پیش رفتوں کی راہیں کشادہ کیں۔ جب عباسی خلافت کے زوال پا جانے کے بعد مسلمانوں نے ایک ایسا نظام معاشرت و سیاست تشکیل دے لیا تھا جو قرآن سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا تو اس وقت وہ امت کی سیاسی حالت کے بارے میں کم متفکر تھے اور محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک داخلی نوعیت کا مذہب تخلیق کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ لیکن مغرب کے ان کی زندگیوں میں مداخلت کرنے سے اہم مذہبی سوالات پیدا ہوگئے۔ امت کی ذلت و تحقیر صرف ایک سیاسی

المیہ ہی نہیں تھی بلکہ وہ مسلمانوں کی روح تک اثر انداز ہوئی تھی۔ یہ نئی کمزوری ظاہر کرتی تھی کہ اسلامی تاریخ میں کوئی کجی رونما ہوگئی ہے۔ قرآن کہتا تھا کہ جو معاشرہ خدا کی رضا کو تسلیم کر لے وہ ناکام نہیں ہوسکتا۔ اسلامی تاریخ اس کا ثبوت تھی۔ جب کبھی تباہی و بربادی نازل ہوئی متقی مسلمانوں نے مذہب سے رجوع کیا' نئے حالات کے مطابق اس سے رہنمائی حاصل کی اور اس طرح نہ صرف امت کا احیاء ممکن ہوا بلکہ عظیم ترین کارنامے سرانجام دیئے گئے۔ اسلامی دنیا سیکولراور بے خدا مغرب کے غلبے تلے زیادہ سے زیادہ پسماندہ کس طرح ہوسکتی تھی؟ مسلمانوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد ان سوالات سے نبرد آزما ہوگئی اور اسلامی تاریخ کو صراط مستقیم پر واپس لانے کی ان کی کوششیں بعض اوقات مایوسانہ اور یاس انگیز بھی ہوگئیں۔ خودکش بمبار' جو کہ اسلامی تاریخ میں ایک غیر معمولی مظہر ہیں' ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ناامیدی کی کیفیت کے ساتھ خطرے کا سامنا کر رہے ہیں۔

الافغانی کی سیاسی مہمات' جو یا تو عجیب تھیں یا غیر اخلاقی' اسی نئی مایوسی کا شکار تھیں۔ مثال کے طور پر 1896ء میں ان کے ایک شاگرد نے شاہِ ایران کو قتل کر دیا۔ مگر ان کے دوست اور رفیق کار مصر کے محمد عبدہٗ (1905ء۔ 1849ء) ایک زیادہ گہرے اور سلجھے ہوئے مفکر تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ اس مسئلے کا حل انقلاب نہیں تعلیم ہے۔ اگرچہ عبدہٗ مصر پر برطانوی قبضے کی وجہ سے رنجیدہ تھے تاہم وہ یورپ کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ یورپیوں سے میل جول رکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے اور مغربی سائنس اور فلسفے کا وسیع مطالعہ کر چکے تھے۔ وہ جدید مغرب کے سیاسی' قانونی اور تعلیمی اداروں کو بہت پسند کرتے تھے۔ مگر ان کا ایمان تھا کہ مصر جیسے مذہبی ملک میں ان اداروں کو قائم نہیں کیا جا سکتا' جہاں جدیدیت کا عمل تو بہت تیز رہا ہے مگر عوام کی اکثریت اس کے دائرے سے باہر ہی رہی ہے۔ جدید قانونی اور آئینی اختراعات کو روایتی اسلامی تصورات کے مطابق ڈھالنا نہایت ضروری ہے تاکہ لوگ انہیں سمجھ سکیں۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد قانون کو نہیں سمجھ سکتے وہ قانون سے عاری معاشرہ بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر شوریٰ کا اسلامی اصول لوگوں کے لیے جمہوریت کے مفہوم کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ تعلیم میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ مدرسوں کے طلبہ کو جدید سائنس پڑھنی چاہیے تاکہ وہ مسلمانوں کو اسلامی تناظر کے ساتھ نئی دنیا میں داخل ہونے میں مدد دے سکیں۔ اس طرح وہ ان کے لیے بامعنی ہوجائے گی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ شریعت کی تجدید کی جائے اور عبدہٗ اور ان کے نوجوان معاصر صحافی رشید رضا

(1935ء۔ 1865ء) دونوں جانتے تھے کہ یہ ایک لمبا اور پیچیدہ عمل ہوگا۔ رضا عرب دانشوروں میں فروغ پاتے ہوئے سیکولرازم پر مشتعل تھے' جو اسلام کو عوام کی پسماندگی کا سبب تصور کرتے تھے۔ رضا کا ایمان تھا کہ اس رویے کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ امتِ مسلمہ مغربی استعماریت کے شکنجے میں مزید پھنس جائے گی۔ رضا ان پہلے مسلمانوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ایک مکمل طور پر جدید لیکن اصلاح شدہ شریعت پر استوار کاملاً اسلامی ریاست کے قیام کی وکالت کی۔ وہ ایک ایسا کالج قائم کرنا چاہتے تھے جہاں طلبہ فقہ اور مذاہب کے سائنسی مطالعے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قانون' عمرانیات' عالمی تاریخ اور جدید سائنس بھی پڑھیں۔ اس اقدام سے یقینی ہو جائے گا کہ اسلامی فقہ حقیقتاً جدید سانچے میں ڈھل کر مشرق اور مغرب کی روایات کا سنگم بن جائے اور شریعت جو ایک زرعی ضابطۂ قانون ہے مغرب کے تشکیل دیئے ہوئے معاشرے سے ہم آہنگ ہو جائے۔

مصلحین کو مستقل احساس تھا کہ انہیں اسلام پر یورپی تنقید کا جواب دینا ہے۔ سیاسی معاملات کی طرح مذہبی معاملات میں بھی مغرب ہی اسلام کی ترجیحات کا تعین کر رہا تھا۔ ہندوستان میں شاعر اور فلسفی محمد اقبال (1938ء۔ 1876ء) نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ اسلام کسی بھی مغربی نظام کے مانند عقلی ہے۔ درحقیقت یہ تو تمام اعترافی مذاہب میں سب سے زیادہ عقلی اور ترقی یافتہ ہے۔ اس کی کڑی وحدت پرستی نے انسانیت کو اساطیر کی خرافات سے نجات دلائی اور قرآن مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ فطرت کا قریبی مشاہدہ اور غور وفکر کریں نیز اپنے اعمال کا مستقل تجزیہ کرتے رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقلیت پسندانہ روح' جس نے جدیدیت کو جنم دیا ہے' حقیقت میں اسلام سے نکلی تھی۔ تاریخ کی یہ تعبیر جانبدارانہ اور ادھوری تھی تاہم اسی زمانے میں مغرب کے عیسائیت کو سب سے برتر عقیدہ اور یورپ کو ہمیشہ ترقی کا ہراول دستہ سمجھنے سے زیادہ متعصبانہ نہیں تھی۔ اقبال کا عقلیت پر اصرار انہیں تصوف کو مسترد کرنے کی طرف لے گیا۔ انہوں نے اسلامی دنیا میں فروغ پاتی ہوئی باطنیت کے برعکس ایک نئے رجحان کی ترجمانی کی کیونکہ ترقی کا واحد راستہ جدید عقلیت پسندی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اقبال مغربی فکر سے بہت متاثر رہے تھے اور انہوں نے لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ تاہم ان کا ایمان تھا کہ مغرب نے تسلسل (یعنی روایت) کی قیمت پر ترقی کی ہے' اس کی سیکولر انفرادیت پسندی نے شخصیت کے تصور کو خدا سے الگ کر دیا ہے اور اسے بت پرستانہ اور شیطانی بنا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مغرب آخرکار اپنے آپ

کو تباہ و برباد کر لے گا۔ اس حقیقت کو پہلی عالمی جنگ کے بعد سمجھ لینا آسان تھا اور اسے یورپ کی اجتماعی خودکشی کے طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کا مشن ہے کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر مراقبے کرنے کی بجائے شریعت کے معاشرتی مثالیوں کو نافذ کرنے والے عمل کے ذریعے زندگی کی الوہی جہت کا مشاہدہ کریں۔

اب تک ہم نے جن مصلحین کا ذکر کیا ہے وہ ایسے دانشور تھے جنہوں نے زیادہ تر تعلیم یافتہ اشرافیہ کو مخاطب کیا۔ مصر میں نوجوان سکول ٹیچر حسن البنا (1906-49ء) نے ایک تنظیم قائم کی جس نے ان کے تصورات کو عام لوگوں تک پہنچایا۔ اخوان المسلمون پورے مشرق وسطیٰ میں ایک عوامی تحریک بن گئی اور ان کا نظریہ اس وقت واحد ایسا نظریہ تھا جو معاشرے کے تمام طبقوں کو متاثر کرنے کا اہل تھا۔ البنا جانتے تھے کہ مسلمانوں کو مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے اور یہ کہ انہیں اپنے سیاسی اور سماجی اداروں کی اصلاح لازماً کرنی چاہیے۔ تاہم اصلاح پسندوں کی طرح ان کا بھی خیال تھا کہ ایسا روحانی اصلاح کے دوش بدوش ہونا ضروری ہے۔ جب حسن البنا نے نہر سویز کے علاقے میں برطانویوں کو عیش وعشرت کے ساتھ رہتے ہوئے دیکھا تو وہ مصری محنت کشوں کی المناک حالت سے اس تضاد کو دیکھ کر رو پڑے۔ انہوں نے اسے ایک مذہبی مسئلے کے طور پر دیکھا اور اس کے مذہبی حل کی ضرورت پر زور دیا۔ جہاں عیسائیوں نے جدیدیت کے چیلنج کا جواب اسے قبول کر کے دیا وہاں مسلمانوں نے اس کا جواب ایک سماجی یا سیاسی کوشش (جہاد) کے ذریعے دیا۔ البنا کہتے تھے کہ اسلام ایک مکمل طرز حیات ہے۔ مذہب کو اس طرح نجی معاملہ قرار نہیں دیا جا سکتا' جیسا کہ مغرب نے قرار دے رکھا ہے۔ اخوان المسلمون نے نہ صرف نئے دور کی روح کے مطابق قرآن کی تعبیر کرنے کی کوشش کی بلکہ اسلامی قوموں کے اتحاد' معیارِ زندگی کو بہتر کرنے' معاشرتی انصاف کے حصول' غربت اور جہالت کے خلاف جنگ اور غیر ملکی تسلط سے مسلمان ملکوں کو آزادی دلانے کے لیے بھی جدوجہد کی۔ نوآبادیاتی حکمرانی کی وجہ سے مسلمان اپنی جڑوں سے کٹ گئے تھے۔ جتنا زیادہ انہوں نے دوسروں کی نقل کی' وہ ثقافتی اعتبار سے دوغلے ہوتے گئے۔ البنا نے اخوانوں کو عبادات اور قرآنی طرز زندگی کی تربیت دینے کی بجائے سکول بنائے' ایک جدید سکاؤٹ تحریک کی بنیاد رکھی' محنت کشوں کے لیے شبینہ سکول کھولے اور

سول سروس کے امتحانات کے لیے ٹیوٹوریل کالج قائم کیے۔ اخوانوں نے دیہی علاقوں میں کلینک اور ہسپتال قائم کیے' کارخانے بنائے جہاں مسلمانوں کو سرکاری شعبے کے مقابلے میں بہتر اجرت ملتی' صحت کی انشورنس ہوتی اور چھٹیاں ملتیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو جدید لیبر قوانین سکھائے تاکہ وہ اپنے حقوق کا دفاع کرسکیں۔ اس تنظیم میں خامیاں بھی تھیں۔ اس کے کچھ ارکان دہشت گردی میں ملوث ہوگئے اور اس کے نتیجے میں تنظیم پر پابندی لگا دی گئی۔ اگرچہ وہ مختلف ناموں سے بحال ہوگئی تاہم بیشتر ارکان — جن کی تعداد 1948ء میں لاکھوں میں تھی — ان الگ تھلگ سرگرمیوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور اپنے فلاحی اور مذہبی مشن کو اہم سمجھتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ تک مصر میں سب سے زیادہ طاقتور سیاسی ادارہ بن جانے والی اس تنظیم کی فوری کامیابی نے ظاہر کیا کہ دانشور یا سیکولر حکومت کچھ بھی کرتی رہے عوام کی اکثریت جدید اور مذہبی ہونے کی خواہاں تھی۔ اس انداز کی سماجی خدمات بہت سی جدید اسلامی تحریکوں کی بھی خصوصیت بن گئی تھیں جن میں شیخ احمد یاسین کی غزہ میں قائم کردہ المجامعہ (اسلامی کانگرس) اہم تنظیم ہے' جس نے 1967ء کی جنگِ جون (JUNE WAR) کے بعد اسرائیلی مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں تک جدیدیت کے ثمرات پہنچانے کے لیے ایسی ہی فلاحی سلطنت (Welfare Empire) قائم کی' مگر ایک اسلامی تناظر میں۔

✿ ✿ ✿ ✿

ایک جدید اسلامی ریاست کیا ہے؟

نو آبادیاتی تجربے اور یورپ سے ٹکراؤ نے اسلامی معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ دنیا بے حد تبدیل ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ جاننا دشوار تھا کہ مغرب کا جواب کیسے دیا جائے کیونکہ درپیش چیلنج بالکل نیا تھا' اس کی پہلے کوئی نظیر موجود نہیں تھی۔ اگر وہ جدید دنیا میں مکمل شریک کار کی حیثیت سے شامل ہونا چاہتے تھے تو مسلمانوں کو یہ تبدیلیاں اپنانا تھیں۔ خاص طور پر مغرب نے حکومت' سائنس اور ٹیکنالوجی کو روایت پسندانہ مذہب کی پابندیوں سے بچانے کے لیے مذہب اور سیاست کو الگ الگ کرنا ضروری محسوس کیا تھا۔ یورپ میں عقیدے کی جگہ قوم پرستی لے چکی تھی' جس نے پہلے تو یورپی معاشروں کو متحد رکھا تاہم انیسویں صدی کا یہ تجربہ مسئلہ انگیز ثابت ہوا۔ یورپ کی قومی ریاستوں نے 1870ء میں ایک اسلحہ کی دوڑ شروع کر دی جو دو عالمی جنگوں کا باعث بنی۔ جیسا کہ نازی ہولوکاسٹ اور سوویت گولاگ (Gulag) نے واضح کر دیا کہ سیکولر نظریات قدیم مذہبی تعصبات ہی کی طرح ہلاکت انگیز ہیں۔ روشن خیال فلسفیوں کو یقین تھا کہ لوگ جتنا زیادہ تعلیم یافتہ ہوں گے وہ اتنے ہی زیادہ عقلیت پسند اور روادار ہو جائیں گے۔ یہ امید بھی ماضی کی مسیحاؤں والی فنتاسیوں کی طرح یوٹوپیائی ثابت ہوئی۔ تاہم جدید معاشرہ جمہوریت سے مخلص ہو گیا۔ جس نے یورپ اور امریکہ میں بیشتر لوگوں کی زندگیوں کو زیادہ منصفانہ اور مساویانہ بنا دیا۔ لیکن مغرب کے لوگوں کو جمہوری تجربے کے لیے تیار ہونے میں صدیاں لگ گئی تھیں۔ ایسے معاشروں میں جدید پارلیمانی نظاموں کو رائج کرنا ایک بالکل مختلف معاملہ تھا جو ہنوز غالب حد تک زرعی تھے یا مکمل طور پر جدید نہیں ہوئے تھے اور جہاں لوگوں کی اکثریت نے جدید سیاسی نظریئے کو ناقابل فہم پایا تھا۔

عیسائیت میں سیاست کو کبھی مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہی تھی۔ بہرحال حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ یہ دنیا ان کی سلطنت نہیں ہے۔ صدیوں تک یورپ کے یہودی اصولی طور پر سیاست میں حصہ لینے سے گریز کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے سیاست ثانوی معاملہ نہیں تھی۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ یہ تو ان کی مذہبی جستجو کی آماجگاہ رہی تھی۔ اسلام میں نجات کا مطلب صرف گناہ سے نجات نہیں تھا بلکہ ایک ایسے منصفانہ معاشرے کی تخلیق بھی مقصود تھی جہاں کوئی فرد آسانی سے اپنی پوری ہستی کو وجودی اطاعت کے لیے وقف کر دے، جس سے اسے سکون و طمانیت حاصل ہو۔ چنانچہ سیاست انتہائی اہم معاملہ تھا اور پوری بیسویں صدی کے دوران ایک حقیقی اسلامی ریاست کے قیام کے لیے یکے بعد دیگرے کوششیں کی جاتی رہیں۔ مگر ایسا ہمیشہ دشوار ہی رہا۔ یہ تو ایک ایسی آرزو تھی جس کے لیے جہاد ضروری تھا۔

توحید کا تصور سیکولرازم کے تصور سے خارج دکھائی دیتا ہے تاہم ماضی میں شیعہ اور سنی ہر دو نے مذہب اور سیاست کی علیحدگی کو تسلیم کر لیا تھا۔ عملی سیاست افراتفری والی اور اکثر و بیشتر ظالمانہ ہوتی ہے جبکہ اسلامی ریاست کوئی ایسا تصور نہیں ہے جسے بس نافذ کر دیا جائے بلکہ سیاسی زندگی کی تلخ حقیقتوں میں قرآن کے مساویانہ مثالیے کو نافذ کرنے کے لیے تخلیقی اختراع اور نظم (ڈسپلن) کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ غلط ہے، جیسا کہ مغربی لوگ بعض اوقات تصور کرتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کے لیے ایک جدید سیکولر معاشرے کو تخلیق کرنا ناممکن بنا دیتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں سیکولر پذیری کا عمل بہت مختلف رہا ہے۔ مغرب میں عمومی طور پر موافق سمجھتے ہوئے اس کا تجربہ کیا گیا۔ ابتدائی ایام میں تو سیکولرازم کو جان لاک (1704ء۔ 1632ء) جیسے فلسفیوں نے مذہبی ہونے کا ایک نیا اور بہتر طریقہ تصور کیا تھا، کیونکہ یہ مذہب کو ریاستی گرفت سے آزاد کرواتا تھا اور اسے اپنے روحانی آدرشوں کو سچائی کے ساتھ بروئے عمل لانے کے قابل بناتا تھا تاہم اسلامی دنیا میں سیکولرازم میں مذہب اور مذہبی لوگوں کو تنقید کا نشانہ ہی بنایا گیا۔

مثال کے طور پر اتاترک نے تمام مدرسوں کو بند کر دیا، صوفی سلسلوں کو دبایا اور مرد و خواتین کو جدید مغربی لباس پہننے پر مجبور کیا۔ اس طرح کے اقدامات ہمیشہ تخریبی ہوا کرتے ہیں۔ اسلام ترکی سے معدوم نہیں ہوا بلکہ وہ زیر زمین چلا گیا۔ محمد علی نے مصری علماء پر پابندیاں لگائیں، ان کی وقف املاک چھین لیں اور انہیں اثر و رسوخ سے محروم کر دیا۔ بعد ازاں جمال عبدالناصر (70-1918ء) نے اسلام کی عسکری مخالفت کی اور اخوان المسلمون پر جبر کیا

گیا۔ ایک اخوان نے، جو کہ اس تنظیم کے خفیہ دہشت گرد شعبے سے تعلق رکھتا تھا، ناصر کی جان لینے کی کوشش کی لیکن اخوانوں کی اکثریت نے، جو کہ ناصر کے ظلم و ستم سے معمور دور میں عقوبت خانوں میں عذاب سہہ رہی تھی، پمفلٹ تقسیم کرنے یا اجلاسوں میں شرکت کے علاوہ اور کوئی اشتعال انگیز کارروائی نہیں کی۔ ایران میں پہلوی بادشاہ بھی اپنے سیکولرازم کے معاملے میں سفاک تھے۔ رضا شاہ پہلوی (1878-41ء) نے علماء سے وقف املاک چھین لیں اور شریعت کی جگہ ایک سول نظام نافذ کر دیا۔ اس نے امام حسینؓ کے احترام میں ہونے والی عاشورہ کی تقریبات کو بند کر دیا اور ایرانیوں کے حج کرنے پر پابندی لگا دی۔ اسلامی لباس ممنوع قرار دے دیا گیا اور رضا کے فوجی گلیوں میں عورتوں کے پردے اپنی سنگینوں کی نوک سے نوچ لیتے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ 1935ء میں جب لوگ اسلامی لباس کے حوالے سے امتناعی قوانین کے خلاف مشہد میں آٹھویں امام کے مزار کے احاطے میں پرامن مظاہرہ کر رہے تھے تو فوجیوں نے گولی چلا دی اور سینکڑوں غیر مسلح لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ وہ علماء جنہوں نے ایران میں غیر معمولی قوت و اقتدار کا لطف اٹھایا تھا اب اپنے اثر و رسوخ کو مٹتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ 1973ء میں اسمبلی میں رضا پر تنقید کرنے والے آیت اللہ مدرسی کو حکومت نے قتل کروا دیا اور علماء اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے مزید کوئی احتجاج نہ کیا۔ رضا کا بیٹا اور جانشین محمد رضا شاہ (1919-80ء) بھی باپ کی طرح اسلام کا دشمن اور اس کی تذلیل کرنے والا ثابت ہوا۔ اس کے اقتدار کے خلاف احتجاج کرنے والے مدرسوں کے طالب علموں کو گلیوں میں گولیاں مار کر قتل کر دیا گیا، مدرسے بند کر دیئے گئے اور ممتاز علماء کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا، زنداں میں ڈال دیا گیا اور ملک بدر کر دیا گیا۔ یہ سیکولر حکومت بالکل بھی جمہوری نہیں تھی۔ شاہ کی خفیہ پولیس ساواک (SAVAK) ایرانیوں کو مقدمہ چلائے بغیر قید میں ڈال دیتی، ان کو تشدد اور تذلیل کا نشانہ بناتی اور وہاں کسی حقیقی نمائندہ حکومت کا کوئی امکان تک نہیں تھا۔

قوم پرستی (نیشنل ازم) بھی، جس کو یورپی خود بیسویں صدی کے اواخر میں ترک کرنا شروع ہو گئے تھے، مسائل انگیز ثابت ہوا۔ طویل عرصے سے امت کی وحدت ایک بنیادی مثالیہ چلی آ رہی تھی اور اب اسلامی دنیا بادشاہتوں اور جمہوریاؤں میں تقسیم ہو گئی تھی، جن کی سرحدیں مغربی طاقتوں نے بنائی تھیں۔ قومی روح کو تشکیل دینا آسان نہیں تھا (کیونکہ مسلمان خود کو عثمانی شہری اور دارالاسلام کے ارکان تصور کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ بعض

اوقات قوم پرستی بالکل منفی رخ اختیار کرگئی اور مغرب سے نجات کی خواہش کو پورا کرنے کا وسیلہ بن گئی۔ کچھ نئی وجود میں آنے والی قومیں اس طرح تخلیق کی گئی تھیں کہ اس کے عوام کے مابین تناؤ موجود تھا۔ مثال کے طور پر سوڈان کے جنوبی حصے میں عیسائیوں کی اکثریت تھی جبکہ شمال میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ جو لوگ مذہبی اصطلاحوں میں اپنے تشخص کے عادی تھے ان کے لیے ایک مشترکہ سوڈانی قوم پرستی کو تسلیم کرنا مشکل تھا۔ یہ مسئلہ لبنان میں تو بہت زیادہ خطرناک روپ اختیار کرگیا جہاں آبادی کم از کم تین مذہبی برادریوں میں برابر برابر منقسم تھی یعنی سنی' شیعہ اور میرونائٹ عیسائی اور اس سے قبل یہ سب خودمختار رہے تھے۔ چنانچہ اقتدار میں شراکت ناممکن ثابت ہوئی۔ آبادیاتی ٹائم بم خانہ جنگی (90-1975ء) کی صورت میں پھٹا جس نے ملک کو المناک انداز میں تقسیم کردیا۔ شام' مصر یا عراق جیسے دوسرے ملکوں میں قوم پرستی کو اشرافیہ نے قبول کرلیا لیکن زیادہ روایت پسند عوام نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ ایران میں پہلویوں کی قوم پرستی اسلام کی براہ راست دشمن تھی۔ اس نے ملک کے شیعیت سے تعلق کو توڑنے اور اس کو اسلام سے پہلے کے زمانے کی قدیم فارسی ثقافت پر استوار کرنے کی کوشش کی۔

جمہوریت نے بھی مسائل پیدا کیے۔ جو مصلحین جدیدیت کو اسلام کی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے تھے انہوں نے واضح کیا کہ جمہوریت کا تصور اسلام کے لیے خطرناک ہے۔ اسلامی قانون شوریٰ اور اجماع کے اصولوں کو بنیادی اہمیت دیتا ہے جس کے مطابق کوئی بھی قانون امت کی اکثریتی رائے سے بنایا جاتا ہے۔ خلفائے راشدین اکثریتی ووٹوں سے منتخب ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں جمہوریت سے بالکل مطابقت رکھتی تھیں۔

مسئلہ صرف وہ طریقہ تھا جس کے تحت مغرب جمہوریت کی تعریف اس طرح کرتا تھا ''عوام کی حکومت' عوام کے ذریعے اور عوام کے لیے۔'' اسلام میں عوام نہیں بلکہ خدا کسی حکومت کو جائز قرار دیتا ہے۔ انسانوں کو اس قدر اہمیت دینا ایک طرح کا ''شرک'' ہے' کیونکہ اس سے خدا کے قادر مطلق ہونے پر زک پڑتی ہے۔ تاہم مسلمان ملکوں کے لیے ایسا کرنا ناممکن نہیں تھا کہ وہ مغربی نعروں کے بغیر حکومت کی نمائندہ صورتوں کو متعارف کروائیں۔ لیکن عملی طور پر جمہوریت کے تصور کو دھندلا دیا گیا۔ ایران میں 1906ء کے آئینی انقلاب کے بعد ایرانیوں نے مجلس (اسمبلی) قائم کی تو شاہ نے روسیوں کی مدد سے اسے ختم کردیا۔ بعد میں جب 1920ء کی دہائی میں برطانوی ایران کو محروسہ ملک بنانے کی کوشش کررہے تھے تو

امریکیوں نے محسوس کیا کہ وہ انتخابات کے نتائج کو اپنے حق میں حاصل کرنے کے لیے اکثر و بیشتر دھاندلی کرتے ہیں۔ بعد میں امریکیوں نے غیر مقبول محمد رضا شاہ کی حمایت کی' جس نے اپنے جدیدیت کے پروگرام کے نفاذ کے لیے نہ صرف مجلس کو ختم کر دیا بلکہ ایرانیوں کے ان بنیادی انسانی حقوق کی بھی نفی کی جن کی جمہوریت ضمانت دیتی ہے۔ اس سے دہرے معیارات کا بھی پتا چلتا ہے۔ مغرب اپنے عوام کے لیے جمہوریت کا دعویٰ تو فخر سے کرتا ہے تاہم مسلمانوں کو آمریت قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ 1923ء سے 1952ء کے دوران مصر میں سترہ عام انتخابات ہوئے جو سب کے سب مقبول عام وفد پارٹی نے جیت لیے مگر وفد کو صرف پانچ مرتبہ حکومت کرنے کی اجازت دی گئی۔ انہیں یا تو برطانیہ نے یا مصر کے بادشاہ نے جبراً اقتدار سے محروم رکھا۔

چنانچہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی جدید جمہوری ریاست قائم کرنا مشکل تھا جس میں مذہب نجی دائرے تک محدود ہوتا۔ دیگر حل قدرے تلخ دکھائی دیتے ہیں۔ 1932ء میں سعودی عرب میں بادشاہت قائم ہوئی جس کی بنیاد وہابیت تھی۔ سرکاری نکتۂ نظر یہ تھا کہ آئین غیر ضروری ہے کیونکہ حکومت کی اساس قرآن ہے۔ سعودیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ جزیرہ نمائے عرب میں حقیقی اسلام کے وارث ہیں جبکہ علماء نے ریاست کو جائز قرار دے دیا۔ اس کے جواب میں بادشاہوں نے روایت پسندانہ مذہبی اقدار کو نافذ کیا۔ عورتوں کو پردے میں اور الگ تھلگ رہنے کا حکم دیا گیا' جوا اور شراب ممنوع قرار دے دیا گیا اور چوروں کے ہاتھ کاٹنے جیسی سزاؤں کو قانون کے نظام میں شامل کر لیا گیا۔ مثال کے طور پر اخوان المسلمون ابتداء ہی سے سعودیوں کے اسلامی سزائیں استعمال کرنے کو نامناسب اور غیر مہذب قرار دے کر تنقید کرتی چلی آ رہی ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ حکمران اشرافیہ بے پناہ دولت مند ہے جبکہ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم قرآنی اقدار کی زیادہ سنگین خلاف ورزی ہے۔

پاکستان ایک اور جدید اسلامی تجربہ ہے۔ ریاست کے بانی محمد علی جناح (1948ء۔ 1876ء) سیکولر آدرش کے گرویدہ تھے۔ اورنگزیب کے زمانے سے مسلمان ہندوستان میں ناخوش تھے اور خود کو یہاں غیر محفوظ محسوس کرتے تھے۔ انہیں اپنے تشخص کے کھونے کا خوف لاحق تھا اور وہ ہندو اکثریت کی طاقت پر مضطرب تھے۔ یہ خوف و اضطراب 1947ء میں برطانیہ کی طرف سے برصغیر کی تقسیم کی وجہ سے اس وقت زیادہ گہرا ہو گیا جب دونوں طرف فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور ہزاروں لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ محمد

علی جناحؒ ایک ایسا سیاسی ماحول تخلیق کرنا چاہتے تھے جس میں مسلمان اپنے مذہبی تشخص کی وجہ سے محدود نہ ہوں۔ لیکن ایک مسلمان ریاست کے لیے اس کا کیا مطلب ہوتا جو ''سیکولر'' بننے کے لیے اسلامی علامتوں کو بہترین طور پر استعمال کرتی ہو؟ ابوالاعلیٰ مودودی (1903-79ء) کی قائم کردہ جماعت اسلامی نے شریعت کے زیادہ سخت نفاذ پر زور دیا اور 1956ء میں آئین نے پاکستان کو باقاعدہ طور پر ایک اسلامی جمہوریہ قرار دے دیا۔ اس سے ایک آرزو کی عکاسی ہوتی تھی جو کہ اب ملک کے سیاسی اداروں میں مجسم ہونا تھی۔ جنرل محمد ایوب خان (1958-69ء) کی حکومت ویسے ہی جارحانہ سیکولرازم کی مثال تھی جس کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے اوقاف کو قومیا لیا' مدرسوں کی تعلیم پر پابندیاں لگا دیں اور ایک خالصتاً سیکولر نظام قانون کو رائج کیا۔ ان کا مقصد اسلام کو ایک مہذب (Civil) اور ریاستی کنٹرول کے تابع مذہب بنانا تھا لیکن اس کے نتیجے میں اسلام پسندوں سے تناؤ پیدا ہوگیا اور آخر کار ایوب زوال سے دوچار ہوئے۔

1970ء کی دہائی کے دوران اسلام پسند قوتیں حکومت کی مخالفت میں یکجا ہوگئیں اور لیفٹسٹ' سیکولرسٹ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو (1928-79ء) نے جوئے اور شراب پر پابندی لگا کر انہیں ہمنوا بنانے کی کوشش کی لیکن یہ اقدامات غیراطمینان بخش ثابت ہوئے اور جولائی 1977ء میں راسخ العقیدہ مسلمان جنرل محمد ضیاء الحق نے کامیابی سے انقلاب برپا کردیا اور ایک بناوٹی طور پر زیادہ اسلامی حکومت قائم کی۔ انہوں نے روایتی مسلم لباس کو دوبارہ رواج دیا اور اسلامی تعزیری اور تجارتی قوانین کو نافذ کیا۔ لیکن صدر ضیا نے بھی اسلام کو سیاسی اور معاشی معاملات سے الگ رکھا بلکہ ان معاملات میں ان کی پالیسی علانیہ طور پر سیکولر تھی۔ 1988ء میں طیارے کے حادثے میں ان کی ہلاکت کے بعد سے پاکستانی سیاست نسلی تناؤ' رقابتوں اور اشرافی طبقوں کے درمیان بدعنوانی کے سکینڈلوں سے بھری ہوئی ہے نیز اسلام پسندوں کا اثر کم ہوگیا ہے۔ اسلام پاکستان کے تشخص کے لیے اب بھی اہمیت رکھتا ہے اور عوامی زندگی میں ہر جگہ موجود ہے لیکن حقیقی سیاست کو متاثر نہیں کرتا۔ مصالحت عباسیوں اور منگولوں کے اقدامات کی باقیات ہے' جو یکساں طور پر مذہب سے اقتدار کی علیحدگی کے قائل تھے۔ لگتا ہے ریاست اسلامی جماعتوں کو ایک حد تک رکھنے کے لیے دباؤ ڈالتی ہے تاہم معاملات کی یہ صورت آدرش سے کوسوں دور ہے۔ ہندوستان کی طرح ایٹمی ہتھیاروں پر نامناسب حد تک زیادہ رقومات صرف کی جاتی ہیں جبکہ آبادی کا کم سے کم ایک تہائی حصہ بے

بسی کے ساتھ غربت و افلاس میں جی رہا ہے' یہ ایک ایسی صورتحال ہے جو کہ حقیقی اسلام کے احساس ہمدردی کے منافی ہے۔ اسلام پسند' جو محسوس کرتے ہیں کہ وہ ریاست کے جبر کا شکار ہیں' پڑوسی ملک افغانستان کی بنیاد پرست طالبان حکومت جیسی حکومت اپنے ملک میں بھی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ مسلمان ابھی تک بیسویں صدی کا مثالی نظام معاشرت و سیاست حاصل نہیں کر سکے تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام جدیدیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اپنی ساری تاریخ میں مسلمان ریاستی ڈھانچوں کو ایک اسلامی مثالیے کے مطابق تشکیل دینے کے لیے جدوجہد اور ایک درست رہنما کی جستجو کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی مذہبی قدر کی طرح سچی اسلامی ریاست کا تصور بھی ماورائی (Transcendent) ہے' اسے کبھی انسانی صورت میں ظاہر نہیں کیا جا سکا اور یہ ہمیشہ کمزور اور ناقص انسانوں کی گرفت سے نکل جاتا ہے۔ مذہبی زندگی دشوار ہوتی ہے جبکہ ہماری جدید ثقافت کی سیکولر عقلیت پسندی تمام بڑی روایتوں کے لوگوں کے لیے خصوصی مسائل پیدا کرتی ہے۔ عیسائی' جو کہ سیاست کی نسبت عقیدے سے زیادہ مغلوب ہیں' اپنے مذہب کو جدید حسیت سے ہم آہنگ کرنے کی جدوجہد میں عقائدی مسئلوں سے نبرد آزما ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت پر بحث کر رہے ہیں' کچھ لوگ عقیدے کی قدیم صورتوں سے چمٹے ہوئے ہیں جبکہ دیگر لوگ زیادہ انقلابی حل ڈھونڈ رہے ہیں۔ بعض اوقات یہ بحثیں اذیت دہ ہو جاتی ہیں' یہاں تک کہ تلخ کلامی بھی ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاملات عیسائی بصیرت کے قلب میں نہاں مذہبیت کو چھو لیتے ہیں۔ ایک جدید اسلامی ریاست کے لیے جدوجہد اسی مخمصے کے مماثل ہے۔ ہر زمانے کے مذہبی لوگوں کو اپنی روایات کے تحت اپنی مخصوص جدیدیت کے چیلنج کا جواب دینا ہے اور اسلامی حکومت کی ایک مثالی صورت کی جستجو کو انوکھا نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اسے جوہری طور پر ایک مذہبی سرگرمی تصور کرنا چاہیے۔

✿ ✿ ✿ ✿

بنیاد پرستی

مغربی میڈیا اکثر و بیشتر یہ تاثر دیتا ہے کہ ''بنیاد پرستی'' کے نام سے مشہور مذہبی جدوجہد، جو بعض اوقات متشددانہ بھی ہو جاتی ہے، ایک خالصتاً اسلامی مظہر ہے۔ جبکہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ بنیاد پرستی ایک عالمی (گلوبل) حقیقت ہے اور ہماری جدیدیت کے جواب میں ہر بڑے عقیدے میں رونما ہو چکی ہے۔ بنیاد پرستانہ یہودیت ہے، بنیاد پرستانہ عیسائیت ہے، بنیاد پرستانہ ہندومت ہے، بنیاد پرستانہ بدھ مت ہے، بنیاد پرستانہ سکھ مت ہے اور یہاں تک کہ بنیاد پرستانہ کنفیوشس مت بھی موجود ہے۔ عقیدے کی یہ قسم سب سے پہلے امریکہ میں عیسائیت میں بیسویں صدی کے شروع میں رونما ہوئی تھی۔ وہ اتفاقی نہیں تھی۔ بنیاد پرستی کوئی ہمہ گیر قسم کی تحریک نہیں ہے بلکہ بنیاد پرستی کی ہر صورت، یہاں تک کہ ایک ہی روایت میں بھی، آزادانہ طور پر پروان چڑھتی ہے اور اپنی علامتوں اور ولولوں کی حامل ہوتی ہے تاہم اس کی مختلف قسموں میں ایک خاندانی مشابہت ہوتی ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ کوئی بنیاد پرستانہ تحریک مغربی جدیدیت کے ظہور کے ردعمل میں فوری طور پر نہیں ابھرتی بلکہ صرف اس وقت رونما ہوتی ہے جب جدیدیت پذیری کا عمل کافی آگے بڑھ چکا ہوتا ہے۔ ابتداء میں مذہبی لوگ اپنی روایتوں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اور جدید ثقافت کو اپناتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان مصلحین نے ایسا ہی کیا تھا۔ تاہم جب ان اعتدال پسندانہ اقدامات کو بے سود پایا جاتا ہے تو کچھ لوگ زیادہ انتہاپسندانہ طریقے استعمال کرنے لگتے ہیں اور یوں ایک بنیاد پرستانہ تحریک جنم لے لیتی ہے۔ ماضی پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ بنیاد پرستی سب سے پہلے جدیدیت کے شوکیس امریکہ میں پیدا ہوئی اور باقی دنیا میں بعد میں۔ درحقیقت تینوں

توحیدی مذاہب میں سے اسلام میں بنیاد پرستی سب سے آخر میں تب رونما ہوئی جب 1960ء اور 1970ء کے عشروں میں جدید ثقافت اسلامی دنیا کے اندر جڑ پکڑنا شروع ہوئی۔ اس وقت تک بنیاد پرستی عیسائیوں اور یہودیوں میں خوب راسخ ہو چکی تھی جو کہ جدیدیت کے تجربے سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔

تمام مذاہب کی بنیاد پرست تحریکیں یکساں خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔ وہ اپنے وعدے پورے نہ کرنے والی جدیدیت سے ایک گہری مایوسی اور تنفر کو منکشف کرتی ہیں۔ وہ حقیقی خوف کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ میں نے جتنی بنیاد پرستانہ تحریکوں کا بھی مطالعہ کیا ہے وہ سب اس بات کی قائل نکلیں کہ سیکولر حکومت نے مذہب کو مٹا دینے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ تاہم یہ ردعمل ہمیشہ خوف کے تحت ہی سامنے نہیں آیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی دنیا میں سیکولرازم کو اکثر بہت جارحانہ انداز میں نافذ کیا جاتا رہا ہے۔ بنیاد پرست لوگ جدیدیت کی یورش سے پہلے فیضان کے لیے ماضی کے ''سنہری دور'' کی طرف دیکھا کرتے تھے لیکن وہ مریضانہ طور پر وسطی عہد کی طرف واپس نہیں جا رہے ہیں۔ یہ سب حقیقت میں جدید تحریکیں ہیں اور ہمارے زمانے کے علاوہ کسی دوسرے زمانے میں رونما ہو بھی نہیں سکتی تھیں۔ مذہب کی نئی تعبیر کے حوالے سے یہ سب اختراع پسند اور انقلابی ہیں۔ اس طرح بنیاد پرستی جدید منظر کا ایک لازمی حصہ ہے۔ جہاں کہیں بھی جدیدیت جڑیں پکڑتی ہے، وہیں ایک بنیاد پرستانہ تحریک اس کے شعوری ردعمل کے طور پر رونما ہو جاتی ہے۔ بنیاد پرست لوگ کسی جدید پیش رفت کی مخالفت اپنی روایت پر ضرورت سے زیادہ اصرار کے ذریعے کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب — یہاں تک کہ امریکہ میں بھی — جمہوریت اور سیکولرازم پر شدید تنقید کرتے ہیں۔ چونکہ عورتوں کی آزادی جدید ثقافت کا ایک نمایاں کارنامہ ہے اس لیے بنیاد پرست لوگوں روایتی زرعی صنفی کردار پر نیز عورتوں کو پردے اور گھر میں واپس جانے پر زور دیتے ہیں۔ لہٰذا بنیاد پرست کمیونٹی کو جدید تجربے کے دھندلے رُخ کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ جدیدیت کے بعض زیادہ تاریک پہلوؤں کو بھی نمایاں کر سکتی ہے۔

چنانچہ بنیاد پرستی جابرانہ سیکولرازم کے ہمراہ موجود ہوتی ہے۔ بنیاد پرست لگ بھگ ہمیشہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ لبرل یا جدت پسند حکومت ان کی مخالف ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کے نظریات اور رویہ زیادہ انتہاپسندانہ ہو جاتا ہے۔ ٹینی سی کے مشہور سکوپس مقدمے (1925ء) کے بعد، جب پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں نے پبلک سکولوں میں نظریہ ٔ ارتقا کی

تدریس کو روکنے کی کوشش کی تھی، سیکولر پریس نے ان کا اس قدر مضحکہ اڑایا کہ ان کی الٰہیات میں زیادہ ردعمل پیدا ہوگیا اور وہ سیاسی منظرنامے پر بائیں سے انتہائی دائیں جانب مڑ گئے۔ جب سیکولر تنقید بہت زیادہ شدید ہوتو بنیاد پرستوں کا ردعمل اس سے بھی زیادہ شدید ہوتا ہے۔ لہٰذا بنیاد پرستی معاشرے میں ایک بڑے شگاف کو منکشف کرتی ہے جو کہ سیکولر ثقافت کو برتنے والوں اور اسے برائی سمجھنے والوں کو تقسیم کر دیتا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے دونوں فریق اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر ہوتے جاتے ہیں۔ یوں بنیاد پرستی لبرل یا سیکولر لوگوں کے ساتھ کسی ثقافت یا قوم کے اندر ہی ایک داخلی جھگڑے کی صورت میں شروع ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلی صورت میں مسلمان بنیاد پرست مغرب یا اسرائیل جیسے خارجی دشمن کی بجائے اپنے ایسے ہم وطنوں یا مسلمانوں کی مخالفت کریں گے، جو جدیدیت کے بارے میں زیادہ مثبت رائے کے حامل ہوں۔ ایسا اکثر و بیشتر ہوتا ہے کہ بنیاد پرست مرکزی دھارے کی ثقافت سے الگ ہوکر اپنا خالص عقیدے کا ایک حصار تخلیق کر لیتے ہیں۔ (مثال کے طور پر جیسا کہ یروشلم یا نیویارک میں انتہائی زیادہ روایت پسند یہودی کرتے ہیں)۔ بعض اوقات وہ جارحیت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں جو مرکزی دھارے کو واپس سیدھے راستے پر لانے اور دنیا کو دوبارہ پاک کرنے کے لیے کئی صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ تمام بنیاد پرست محسوس کرتے ہیں کہ وہ بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں اور چونکہ ان کی پشت دیوار سے لگی ہوتی ہے اس لیے وہ یقین کر سکتے ہیں کہ انہیں جنگ لڑنا ہی ہوگی۔ اس سوچ کے ساتھ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ بنیاد پرست دہشت گردی اختیار کر لیتے ہیں۔ تاہم اکثریت تشدد آمیز کارروائیاں نہیں کرتی بلکہ زیادہ قانون پسندانہ طریقے سے اپنے عقیدے کے احیاء کی کوشش کرتی ہے۔

جہاں تک مذہب کو گوشے سے نکالنے اور مرکزی سٹیج پر لانے کا تعلق ہے تو بنیاد پرست کامیاب رہے ہیں لہٰذا اب یہ بین الاقوامی معاملات میں ایک بار پھر اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسی پیش رفت ہے جس کے بارے میں بیسویں صدی کے درمیان میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا، جب سیکولرازم عروج پر دکھائی دیتا تھا۔ یقیناً 1970ء کی دہائی سے اسلامی دنیا کا معاملہ بھی ایسا ہی چلا آ رہا ہے تاہم بنیاد پرستی مذہب کو ایک سیاسی مقصد کے طور پر ''استعمال کرنا'' ہی نہیں ہے۔ بلکہ جوہری طور پر تو یہ تحریکیں سیکولر لوگوں کے عوامی زندگیوں سے الوہیت کو نکال دینے کے عمل کے خلاف بغاوتیں ہیں نیز جدید دنیا میں روحانی اقدار کو

غالب کرنے کی مسلسل مایوسانہ کوشش۔ تاہم بنیاد پرستی کی آگ کو تیز کرنے والی مایوسی اور خوف مذہبی روایت کو بھی مسخ کر دیتے ہیں اوراعتدال اور مصالحت و مفاہمت کی تبلیغ کرنے والوں کی قیمت پر اس کے جارحانہ پہلوؤں کو زیادہ ابھار دیتے ہیں۔

اسلامی بنیاد پرستی ان عمومی خصوصیات سے بہت زیادہ مملو ہے۔ تاہم یہ سوچنا درست نہیں ہے کہ خود اسلام ہی کوئی متشددانہ یا جنونی خصوصیت رکھتا ہے جو مسلمانوں کو جدیدیت کے جنونی اور متشددانہ استرداد پر اکساتی ہے۔ مسلمان بھی دنیا کے تمام مذاہب کے بنیاد پرستوں جیسے ہی ہیں اور ان میں جدید سیکولر ثقافت کے بارے میں گہرے شکوک مشترک طور پر موجود ہیں۔ یہ بھی ذکر کر دینا چاہیے کہ مسلمان ''بنیاد پرستی'' کی اصطلاح استعمال کرنے پر جو اعتراض کرتے ہیں وہ بالکل درست ہے کیونکہ امریکی پروٹسٹنٹوں نے تو اسے مفخریہ طور پر وضع کیا تھا اور اسے سودمند انداز میں عربی میں ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ''اصول'' کی اصطلاح اسلامی فقہ کے بنیادی اصولوں کی ترجمانی کرتی ہے اور چونکہ تمام مسلمان ان پر متفق ہیں اس لیے سارے ہی مسلمانوں کو ''اصولیہ'' (Fundamentalist) کہا جا سکتا ہے۔ تاہم تمام خامیوں کے باوجود یہ واحد اصطلاح ہے جس کے ذریعے ہمیں ان جنگ آزما مذہبی تحریکوں کے خاندان کا ذکر کرنا ہے جبکہ اس کا تسلی بخش متبادل ڈھونڈنا کافی مشکل ہے۔

پاکستان کی جماعت اسلامی کے بانی ابوالاعلیٰ مودودی اولین بنیاد پرست نظریہ سازوں میں سے ایک ہیں۔ وہ مغرب کی زبردست قوت کو اس زاویے سے دیکھتے تھے کہ یہ اسلام کو کچلنے کے لیے مجتمع ہو رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مسلمان اپنے مذہب اور ثقافت کی بقا چاہتے ہیں تو انہیں بڑھتے ہوئے سیکولرازم سے لڑنے کے لیے لازماً اکٹھے ہونا ہوگا۔ مسلمانوں نے پہلے بھی دشمن معاشروں کا سامنا کیا تھا اور وہ تباہیوں سے بھی دوچار ہو چکے تھے۔ تاہم جمال الدین افغانی سے آغاز کرتے ہوئے اسلام میں ایک اور رجحان بھی سرایت کر گیا۔ مغرب کے خطرے نے مسلمانوں کو پہلی بار مزاحمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مودودی نے مکمل سیکولر نظریے ہی کو مسترد کر دیا' یعنی وہ آزادی کی ایک اسلامی الٰہیات پیش کر رہے تھے۔ چونکہ صرف خدا ہی مطلق حاکم ہے لہٰذا کسی کو بھی کسی دوسرے انسان سے احکامات نہیں لینے چاہئیں۔ نوآبادیاتی طاقتوں کے خلاف انقلاب' ایک حق نہیں بلکہ فریضہ ہے۔ مودودی نے آفاقی جہاد کی صدا بلند کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح رسول کریم ﷺ نے ''جاہلیت''

(اسلام سے پہلے کے زمانے کی جہالت اور سفاکی) کے خلاف جنگ کی تھی اسی طرح آج کے مسلمانوں کو مغرب کی جدید جاہلیت کے مقابلے کے لیے اپنی ساری قوتوں کو استعمال کرنا چاہیے۔

تاہم سُنّی دنیا میں اسلامی بنیاد پرستی کے حقیقی بانی سید قطب (1906-66ء) تھے' جو کہ مودودی سے بہت متاثر تھے۔ اگرچہ وہ حقیقت میں انتہا پسند نہیں رہے تھے تاہم مغربی ثقافت اور سیکولر سیاست کے حوالے سے جوش اور ولولے سے لبریز تھے۔ 1953ء میں اخوان المسلمون کا رکن بننے کے بعد بھی وہ ایک ایسے اصلاح پسند ہی رہے جو مغربی جمہوریت کو ایک اسلامی جہت دینے کے بارے میں پرامید تھا جس سے ایک کاملاً سیکولر نظریے کے رطب و یابس سے بچا جا سکتا ہو۔ تاہم 1956ء میں ناصر نے انہیں اخوان المسلمون کا رکن بننے کی پاداش میں قید کر دیا اور عقوبت خانے میں وہ اس سوچ کے قائل ہو گئے کہ مذہبی اور سیکولر لوگ ایک ہی معاشرے میں امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے اخوانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا مشاہدہ کیا اور مصر میں مذہب کے کردار کو محدود کرنے کے ناصر کے واضح عزم پر غور و فکر کیا۔ وہ جاہلیت کی تمام خصوصیات کو دیکھ سکتے تھے' جسے انہوں نے ایسی بربریت قرار دیا جو ہمیشہ عقیدے کی دشمن رہی تھی اور مسلمان پابند ہیں کہ رسول کریم ﷺ کی مثال پر عمل کرتے ہوئے موت تک اس سے جنگ لڑیں۔ قطب مودودی سے آگے چلے گئے تھے جو کہ صرف غیر مسلم معاشروں کو ''جاہلی'' قرار دیتے تھے۔ جاہلیت کی اصطلاح کو روایتی مسلمان مؤرخ عرب میں اسلام سے پہلے کے زمانے کو بیان کرنے کے لیے ہی استعمال کرتے آئے تھے لیکن قطب نے اس کا اطلاق معاصر مسلمان معاشرے پر بھی کیا۔ ناصر جیسے حکمران جو ظاہرہ طور پر اسلام کا نام لیتے ہیں مگر ان کی گفتار و اعمال ثابت کرتے ہیں کہ وہ مرتد ہیں لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ایسی حکومت کو ختم کر دیں' بالکل اسی طرح جس طرح رسول کریم ﷺ نے مکہ کے مشرکوں (آپ ﷺ کے عہد کی جاہلیت) کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دیا تھا۔

ناصر کے متشددانہ سیکولرازم کی وجہ سے قطب نے اسلام کی ایک ایسی صورت وضع کی جس نے قرآن کے پیغام اور رسول کریم ﷺ کی حیات مبارکہ دونوں کو مسخ کر دیا۔ قطب نے مسلمانوں کو حضرت محمد ﷺ کے سانچے میں ڈھلنے کی تلقین کی یعنی انہیں معاشرے کے مرکزی دھارے سے الگ ہو جانا چاہیے۔ (جیسے حضرت محمد ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کر لی تھی) اور پھر ایک متشددانہ جہاد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔ حالانکہ حضرت محمد ﷺ نے حقیقت

میں عدم تشدد کی ایک صاف دلانہ پالیسی کے ذریعے آخرکار فتح حاصل کرلی تھی۔ قرآن نے مذہبی معاملات میں جبر و استبداد کی کھلم کھلا مخالفت کی اور اس کا وژن' علیحدگی اور اخراج کے پرچار سے بہت مختلف یعنی اعتدال اور شمولیت کا تھا۔ قطب کا اصرار تھا کہ اعتدال کے قرآنی حکم پر عمل صرف اسلام کی سیاسی فتح اور ایک حقیقی اسلامی ریاست کے قیام کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہ نئی انتہاپسندی اس گہرے خوف سے پھوٹی تھی جو کہ بنیاد پرستانہ مذہب کے قلب میں نہاں ہوتا ہے۔ قطب باقی نہ رہے۔ ناصر کی ذاتی تاکید پر انہیں 1966ء میں سزائے موت دے دی گئی۔

ہر سُنّی بنیاد پرست تحریک قطب سے متاثر رہی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو انوارالسادات جیسے رہنماؤں کو قتل کرنے کی تحریک دی' یوں مذمت کرتے ہوئے کہ وہ اپنے عوام کے لیے جاری کی گئیں جابرانہ پالیسیوں کی وجہ سے ایک جاہلی حکمران تھا۔ 1994ء میں افغانستان میں برسراقتدار آنے والے طالبان بھی ان کے نظریے سے متاثر ہیں۔ وہ اپنے نکتہ نظر کے مطابق اسلام کے اصلی وژن کی طرف واپس آنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ علماء حکومت کے لیڈر ہیں' عورتوں کو پردے میں رہنے کا پابند کردیا گیا ہے اور انہیں پیشہ ورانہ زندگی میں حصہ لینے سے روک دیا گیا ہے۔ صرف اسلامی نشریات کی اجازت ہے اور سنگساری اور اعضاء کاٹنے کی اسلامی سزائیں دوبارہ متعارف کرائی جارہی ہیں۔ مغرب کے کچھ حلقوں میں طالبان کو کامل مسلمانوں کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی حکومت بنیادی اسلامی تصورات کی خلاف ورزی کررہی ہے۔ بیشتر طالبان (مدرسوں کے طلباء) پختون ہیں اور ان غیرپختونوں کو نشانہ بنانے کا رجحان رکھتے ہیں' جو ملک کے شمال میں حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن اور رسول کریم ﷺ نے اس طرح کی نسلی شاونیت سے منع فرمایا تھا۔ اقلیتوں کے ساتھ ان کا درشت رویہ بھی واضح قرآنی تقاضوں کے خلاف ہے۔ عورتوں کے خلاف طالبان کی امتیازی روش رسول کریم ﷺ کے عمل اور اولین امت کی روش کے مکمل طور پر خلاف ہے۔ تاہم طالبان اپنے انتہائی محدود مذہبی وژن کے حوالے سے خاص قسم کے بنیاد پرست ہیں (جو کہ کچھ پاکستانی مدرسوں میں ان کی تنگ نظری پر مبنی تدریس کی عکاسی کرتا ہے)' جو عقیدے میں تحریف کرتا ہے اور اس کو اصل راستے سے بالکل الٹ سمت میں موڑ دیتا ہے۔ تمام بڑے عقیدوں کی طرح مسلمان بنیاد پرست بھی اپنی بقا کی جدوجہد میں مذہب کو جبر اور حتیٰ کہ تشدد کا بھی آلہ بنالیتے ہیں۔

تاہم بیشتر سُنّی بنیاد پرست اس طرح کے انتہا پسند نہیں ہیں۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں ابھرنے والی بنیاد پرستی کی تحریکیں دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے کوشاں تھیں' لیکن تشدد کی بجائے تبلیغ کے ذریعے۔ 1967ء میں اسرائیل کے ہاتھوں عرب افواج کی شکست کے بعد پورے مشرقِ وسطٰی میں مذہب کی طرف جھکاؤ زیادہ ہو گیا۔ ناصر جیسے لیڈروں کی پرانی سیکولر پالیسیاں بے اعتبار ہو کر رہ گئیں۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان اس لیے ناکام ہو گئے تھے کیونکہ وہ اپنے مذہب کے ساتھ سچے نہیں تھے۔ وہ یہ دیکھ سکتے تھے کہ مغرب میں تو جمہوریت اور سیکولرازم خوب کام کر رہے ہیں جبکہ اسلامی دنیا میں عام مسلمانوں کی بجائے صرف اشرافیہ ہی کو اس کے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ بنیاد پرستی کو ایک ''مابعد جدید'' (پوسٹ ماڈرن) تحریک کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جو جدیدیت کے کچھ اصولوں اور ولولوں کو مسترد کرتی ہے مثلاً نوآبادیاتی نظام۔ پوری اسلامی دنیا میں طالب علموں اور کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کشوں نے اپنے ماحول کی تبدیلی کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنی یونیورسٹیوں اور کارخانوں میں مسجدیں تعمیر کیں' جہاں وہ صلوٰۃ قائم کر سکیں' حسن البنا کے انداز میں اسلام کی اساس پر فلاحی تنظیمیں بنائیں' جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسلام سیکولر حکومتوں کی نسبت لوگوں کی زیادہ خدمت کرتا ہے۔ جب طلبہ کسی لان کے سایہ دار گوشے ــــ یا حتیٰ کہ ایک نوٹس بورڈ ــــ کو ایک اسلامی علاقہ قرار دیتے تو وہ محسوس کرتے کہ انہوں نے سیکولر معاشرے میں الگ تھلگ کر دیئے گئے اسلام کو اس محدود سلطنت سے نکالنے کی ایک چھوٹی سی لیکن اہم کوشش کی ہے اور اسلام کے لیے ــــ چھوٹا سا سہی ــــ دنیا میں ایک حصہ دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ وہ تقدس کی سرحدوں کو آگے ہی آگے بڑھاتے جاتے' ان یہودی بنیاد پرستوں کی طرح جنہوں نے عرب زمین پر دعویٰ کرتے ہوئے اور اسے یہودیت کی سرپرستی میں لاتے ہوئے مقبوضہ مغربی کنارے میں آبادیاں بنالی تھیں۔

اسلامی لباس کو دوبارہ اپنانے کے پیچھے بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ جب اسے لوگوں کی مرضی کے خلاف ان پر لازم قرار دے دیا جائے (جیسا کہ طالبان نے کیا) تو یہ جابرانہ اقدام بن جاتا ہے اور رضا شاہ پہلوی کی جارحانہ تیکنیکوں کی طرح سخت ردعمل پیدا کرتا ہے۔ تاہم بہت سی مسلمان عورتیں محسوس کرتی ہیں کہ پردہ کرنا نوآبادیاتی دور سے پہلے کے زمانے کی طرف علامتی واپسی ہے' جب ان کے معاشرے کو اپنے حقیقی راستے سے ہٹایا نہیں گیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے فقط گھڑی کی سوئیاں پیچھے نہیں کیں۔ سروے ظاہر کرتے ہیں

کہ پردہ نشین عورتوں کی اکثریت صنف جیسے معاملات پر ترقی پسندانہ آرا کی حامل ہے۔ دیہی علاقوں سے یونیورسٹی پہنچنے والی اور بنیادی خواندگی سے آگے تک پڑھنے والی اپنے خاندان کی پہلی خواتین میں سے کچھ نے کہا کہ اسلامی لباس تسلسل فراہم کرتا ہے اور جدیدیت کی طرف پیش رفت کو دوسری صورت میں پیدا ہونے والی دقتوں سے کم دشوار بنا دیتا ہے۔ وہ جدید دنیا میں شامل رہی ہیں مگر اپنی شرائط پر اور اسلامی تناظر میں' جو کہ ان کے سفر کو تقدس عطا کر دیتا ہے۔ پردے کو جدیدیت کے چند کم مثبت پہلوؤں پر ایک تنقید بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ جنسی معاملات میں مغرب کے سب کچھ عیاں کر دینے کی اجنبی پابندی کو رد کرتا ہے۔ مغرب میں بیشتر لوگ اپنے جسموں کا مظاہرہ کرنے کو اپنا استحقاق سمجھتے ہیں' وہ بڑھاپے کے آثار کے خلاف عمل کرنے اور اسی زندگی سے چمٹے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مستور بدن ان کے ماورائیت اساسی ہونے کی غمازی کرتے ہیں اور لباس کی یکسانیت طبقاتی اختلافات کو مٹاتی ہے۔ نیز مغرب کی انفرادیت پسندی کے مقابلے میں کمیونٹی کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

لوگ مذہب کو اکثر و بیشتر جدید تصورات اور ولولوں کو قابل فہم بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر 1776ء کے امریکی انقلاب کے زمانے کے تمام امریکی کیلونسٹ وطن کے بانیوں کے سیکولر نظریے کو سمجھتے تک نہیں تھے۔ انہوں نے جدوجہد کو عیسائی رنگ دیا تاکہ وہ نئی دنیا کی تخلیق کے لیے سیکولر لوگوں کے شانہ بشانہ لڑ سکیں۔ کچھ سُنّی اور شیعہ بنیاد پرست بھی جدید ثقافت کے اجنبی اصولوں کو آشنا بنانے کے لیے مذہب کو استعمال کر رہے ہیں اور اسے زیادہ قابل قبول بنانے کے لیے روحانی تناظر عطا کر رہے ہیں۔ یوں ایک بار پھر وہ خاموشی سے تسلیم کر رہے ہیں کہ مغربی ثقافت کی بجائے دیگر ثقافتوں کی بنیاد پر بھی جدید بنا جا سکتا ہے۔ 9-1978ء کے ایرانی انقلاب کو اس روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ 1960ء کی دہائی کے دوران آیت اللہ روح اللہ خمینی (89-1902ء) ایران کے لوگوں کو محمد رضا شاہ کی ظالمانہ اور غیر آئینی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے گلیوں میں لے آئے تھے' انہوں نے بادشاہ کو کربلا میں حضرت امام حسینؓ کو شہید کروانے والے اموی خلیفہ یزید کا خطاب دیا' جو کہ شیعیت میں غیر منصف حکمران کی علامت ہے۔ ایسے جبر و استبداد کے خلاف لڑنا مسلمانوں پر فرض ہے اور جن لوگوں کو انقلاب کی سوشلسٹ صدا متحرک نہیں کر سکتی تھی وہ خمینی کے بلاوے کو قبول کر سکتے تھے جو کہ ان گہری روایتوں سے جڑے ہوئے تھے۔

خمینی نے شاہ کی سیکولر قوم پرستی کا شیعی متبادل پیش کیا۔ وہ اماموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مشابہہ ہوتے چلے گئے۔ ان پر حملے کیے گئے' انہیں زندان میں ڈالا گیا اور چند اماموں کی طرح انہیں بھی ایک غیر منصف حکمران نے تقریباً قتل ہی کر دیا تھا' انہیں جبراً وطن بدر کر دیا گیا اور جو کچھ بھی وہ رکھتے تھے اس سے انہیں محروم کر دیا گیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کی طرح انہوں نے بہادری کے ساتھ ناانصافی کی مخالفت کی اور سچی اسلامی اقدار کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ تمام اماموں کی طرح وہ ایک عملی صوفی مشہور تھے۔ حضرت امام حسینؓ کی طرح' جن کا بیٹا کربلا میں شہید کر دیا گیا تھا' خمینی کے بیٹے مصطفیٰ کو بھی شاہ کے کارندوں نے قتل کر دیا۔

نیم سرکاری اخبار ''اطلاعات'' میں خمینی پر بہتان آمیز تنقید اور گلیوں میں احتجاج کرنے والے مدرسوں کے نوجوان طالب علموں کے دل دہلا دینے والے قتل عام کے بعد 1978ء میں انقلاب برپا ہوا تو خمینی نے دور رہ کر (نجف سے' جہاں وہ جلاوطنی میں قیام پذیر تھے) آپریشنز کے لیے یوں ہدایات جاری کیں جیسے وہ امام غائب ہوں۔ سیکولر افراد اور دانشور علماء کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کے لیے راضی تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ صرف خمینی ہی عوام کی تائید و حمایت حاصل کر سکتے ہیں۔ اسلامی انقلاب واحد ایسا انقلاب تھا جو بیسویں صدی کے ایک نظریے سے متاثر تھا (روسی اور چینی انقلابات کارل مارکس کے انیسویں صدی کے وژن سے متاثر تھے)۔ خمینی نے شیعیت کی ایک نئی انقلابی تعبیر کی۔ ان کا کہنا تھا کہ امام غائب کی عدم موجودگی میں صرف مقدس قانون سے آگاہ روحانی طور پر فیضان یافتہ فقیہہ ہی قوم پر حکمرانی کا حق رکھتا ہے۔ بارہ اماموں کو ماننے والے شیعہ صدیوں سے مذہبی پیشواؤں کو حکومت میں شرکت سے روکے ہوئے تھے تاہم ولایت فقیہہ کے اس انقلابی نظریے کو تسلیم کرنے پر رضامند تھے (گو کہ بہت سے علماء رضامند نہیں تھے) 1۔ پورے انقلاب کے دوران کربلا کی علامتیں چھائی رہیں۔ فوت ہونے والوں کے لیے منعقد کی جانے والی ماتمی تقریبات اور حضرت حسینؓ کے احترام میں نکالے جانے والے عاشورہ کے جلوس حکومت کے خلاف مظاہروں میں ڈھل گئے۔ کربلا کے واقعے سے تحریک پا کر عام شیعوں میں شاہ کی بندوقوں کا سامنے کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور ہزاروں لوگوں نے کفن اوڑھ کر موت کو گلے لگا لیا۔ مذہب اتنا طاقتور ثابت ہوا کہ اس نے پہلوی ریاست کو منہدم کر دیا جو کہ مشرقِ وسطیٰ میں سب سے زیادہ مستحکم اور طاقتور دکھائی دیتی تھی۔

تاہم تمام بنیاد پرستوں کی طرح خمینی کا وژن بھی مسخ شدہ تھا۔ تہران میں امریکی یرغمالیوں کا واقعہ (اور بعدازاں ایرانی مثال سے تحریک پاکر شیعہ انقلابی لبنانیوں کا واقعہ) قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کے واضح قرآنی احکامات کی خلاف ورزی تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ قیدیوں کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آؤ اور جتنی جلد ممکن ہو انہیں آزاد کردیا جائے جبکہ خمینی نے اغوا کنندگان کو اپنی جیب سے انعام دیا۔ درحقیقت قرآن سوائے جنگ کے کسی کو قیدی بنانے کی ممانعت کرتا ہے' اس حکم سے امن کے زمانے میں اغوا برائے تاوان کا انسداد ہوتا ہے۔ 2۔ انقلاب کے بعد خمینی نے اختلاف کو دبانے کے لیے ''اظہار کی وحدت'' کا نعرہ لگایا۔ اظہار کی آزادی نہ صرف انقلاب کے اہم مطالبات میں ایک مطالبے کے طور پر شامل رہی تھی بلکہ اسلام نے نظریاتی جبریت پر کبھی زور نہیں دیا۔ سوائے عمل کی یکسانیت کے۔ قرآن میں مذہبی معاملات میں جبر سے منع کیا گیا ہے اور خمینی کے روحانی استاد ملا صدرا نے بھی اس سے منع کیا تھا۔ جب 14 فروری 1989ء کو خمینی نے ''شیطانی آیات'' (The Satanic Verses) میں حضرت محمد ﷺ کا مبینہ طور پر توہین آمیز خاکہ لکھنے پر ناول نگار سلمان رشدی کے خلاف فتویٰ جاری کیا تو انہوں نے فکر کی آزادی کا جذباتی دفاع کرنے والے ملا صدرا سے بھی انحراف کیا تھا۔ اس فتوے کو الازہر اور سعودی عرب کے علماء نے غیر اسلامی قرار دیا اور اگلے ہی ماہ اسلامی کانفرنس کے انچاس میں سے اڑتالیس ارکان نے اس کی مذمت کی۔

تاہم ایسا لگتا ہے کہ انقلاب نے ایرانی لوگوں کو اپنی شرائط پر جدیدیت کی طرف آنے میں مدد دی ہے۔ خمینی نے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے پارلیمینٹ کو زیادہ اختیارات منتقل کرنے کی کوشش کی اور ان کی دعاؤں کے ساتھ مجلس کے سپیکر ہاشمی رفسنجانی نے ولایت فقیہہ کی جمہوری تعبیر کی۔ جدید ریاست کے تقاضوں نے شیعوں کو جمہوریت کی ضرورت کا قائل کرلیا تھا لیکن اس مرتبہ یہ ایک اسلامی روپ میں آئی جس کی وجہ سے یہ لوگوں کی اکثریت کے لیے قابل قبول ہوگئی۔ اس پر 23 مئی 1997ء کو مہر تصدیق ثبت ہوگئی جب حجتہ الاسلام سید خاتمی نے صدارتی انتخاب میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے جلد ہی واضح کیا کہ وہ مغرب کے ساتھ زیادہ مثبت تعلق استوار کرنا چاہتے ہیں اور ستمبر

1998ء میں انہوں نے رشدی کے خلاف فتوے سے لاتعلقی اختیار کرنے کا اعلان کیا' یہ ایک ایسا اقدام تھا جس کی ایران کے اعلیٰ ترین فقیہہ آیت اللہ خامنہ ای نے بھی بعد میں توثیق کی۔ خاتمی کا انتخاب عظیم تر تکثیریت' اسلامی قانون کی زیادہ نرم تعبیر' زیادہ جمہوریت اور عورتوں کے لیے زیادہ ترقی پسندانہ پالیسی کے حوالے سے لوگوں کی اکثریت کی بھرپور خواہش کی علامت ہے۔ جنگ ابھی تک جیتی نہیں گئی ہے۔ وہ روایت پرست مذہبی پیشوا جنہوں نے خمینی کی مخالفت کی تھی اور جن کے لیے ان کے پاس تھوڑا وقت ہوتا تھا' اب بھی خاتمی کی بہت سی اصلاحات کو کالعدم کرنے کے اہل ہیں تاہم قرآن کی روح کے مطابق ایک حقیقی اسلامی ریاست کو تشکیل دینے کی جدوجہد اب بھی ایرانی لوگوں کی سب سے بڑی دلچسپی ہے۔

مسلمان اقلیت میں

مغربی معاشرہ اسلامی بنیاد پرستی سے خوفزدہ ہے جبکہ وہ اپنے مذاہب کی اتنی ہی غالب اور متشددانہ بنیاد پرستی سے خطرہ محسوس کرتا نظر نہیں آتا ہے۔ اس وجہ سے مغربی لوگوں کا اپنے ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے حوالے سے رویہ یقیناً متاثر ہوا ہے۔ یورپ میں پچاس ساٹھ لاکھ مسلمان رہتے ہیں اور امریکہ میں ان کی تعداد ستر اسّی لاکھ ہے۔ جرمنی اور فرانس میں ایک ایک ہزار مسجدیں ہیں جبکہ برطانیہ میں پانچ سو مسجدیں ہیں۔ آج مغرب میں موجود مسلمانوں کی تعداد کا نصف 1950ء اور 1960ء کے عشروں میں نقل مکانی کر کے وہاں آنے والوں کی اولاد ہے۔ انہوں نے اپنے والدین کی کمزور مثال کو مسترد کر دیا ہے۔ وہ بہتر تعلیم یافتہ ہیں اور زیادہ نمایاں ہونے اور قبولیت کے خواہشمند ہیں۔ بعض اوقات ان کی کاوشیں عاقبت نااندیشانہ ہوتی ہیں جیسے مثال کے طور پر 1990ء کی دہائی میں برطانیہ میں ڈاکٹر کلیم صدیقی کا مسلم پارلیمینٹ کا نعرہ۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس کو برطانوی مسلمانوں کی طرف سے بہت تھوڑی حمایت حاصل ہوئی تاہم اس سے لوگ خوفزدہ ضرور ہو گئے کہ مسلمان معاشرے کے مرکزی دھارے میں شامل ہونے پر راضی نہیں ہیں۔ ''شیطانی آیات'' کے بحران کے دوران مسلمان کمیونٹی کے بارے میں اس وقت وسیع معاندت پیدا ہو گئی تھی جب انہوں نے بریڈفورڈ میں کتاب کو کھلے عام نذر آتش کیا تھا۔ یورپ کے لوگ بظاہر اپنے مسلمان ہم وطنوں کے ساتھ متوازن برتاؤ کرنا دشوار پاتے ہیں۔ جرمنی میں ترک تارکین وطن نسلی فسادات میں قتل کیے جاتے رہے ہیں، فرانسیسی اخبارات میں ان لڑکیوں کے بارے میں معاندانہ خبریں شائع ہوئی ہیں جنہوں نے ''حجاب'' اوڑھ کر سکول جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب

برطانیہ میں مسلمانوں نے اپنے بچوں کے لیے الگ سکولوں کی درخواست کی تو اس پر اکثر وبیشتر غصے کا اظہار کیا گیا حالانکہ لوگ یہودیوں، رومن کیتھولکوں یا کوئیکرز (Quakers) کے لیے خصوصی سکولوں پر اسی طرح اعتراضات نہیں کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے لوگ مسلمانوں کو برطانوی معاشرے کی جڑیں کاٹنے والا پانچواں کالم تصور کرتے ہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں کی حالت بہتر ہے۔ وہاں مسلمان بہتر تعلیم یافتہ اور درمیانے طبقے میں شامل ہیں۔ وہاں وہ ڈاکٹر، اساتذہ اور انجینئر کے طور پر کام کرتے ہیں جبکہ یورپ میں اسلامی کمیونٹی ہنوز محنت کش طبقے (ورکنگ کلاس) ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

امریکی مسلمانوں نے امریکہ کو خود چنا ہے۔ وہ امریکی بننے کے خواہشمند ہیں اور یورپ کی نسبت امریکہ میں گھل مل جانے کا امکان زیادہ ہے۔ نیشن آف اسلام (Nation of Islam) کہلانے والے سیاہ فاموں کے علیحدگی پسند گروپ کے کرشماتی رہنما میلکم ایکس (1925-65ء) جیسے مسلمانوں نے شہری حقوق کی تحریک کے زمانے میں ہمہ گیر عزت و احترام حاصل کیا اور سیاہ فاموں اور مسلمانوں کی قوت کی علامت بن گئے۔ تاہم نیشن آف اسلام ایک بدعتی پارٹی تھی۔ ڈیٹرائٹ کے ایک پھیری والے ولی فرد محمد فرد (WALI FARD MUHAMMAD FARD) نے 1930ء میں اسے قائم کیا تھا۔ 1934ء میں فرد کے پراسرار انداز میں غائب ہو جانے کے بعد علی جاہ محمد (Elijah Muhammad) (1975ء۔ 1897ء) نے اس کی قیادت سنبھالی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خدا فرد کے روپ میں اترا تھا، سفید فام لوگ پیدائشی طور پر برے ہوتے ہیں اور موت کے بعد زندگی نہیں ہوتی۔ یہ سب تصورات اسلامی نکتہ نظر سے بدعتی تصورات ہیں۔ نیشن آف اسلام نے غلامی کے زمانے کی تلافی کے طور پر افریقی امریکیوں کے لیے الگ ریاست کا مطالبہ کیا نیز وہ مغرب کی کھلم کھلا دشمن ہے۔ تاہم میلکم ایکس Malcolm X نیشن آف اسلام کے سحر سے آزاد ہو گئے تھے۔ انہیں علی جاہ محمد کی اخلاقی خرابیوں کا پتا چلا تو انہوں نے اپنے پیروکاروں کے ساتھ سُنّی اسلام قبول کرلیا۔ دو سال بعد انہیں اس ارتداد کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔ تاہم میلکم ایکس کے قائم کردہ ''مسلم مشن'' کی نسبت ''نیشن آف اسلام'' کو اب بھی بہت زیادہ میڈیا کوریج ملتی ہے۔ ''مسلم مشن'' اب پوری طرح روایت پسند ہو چکی ہے، وہ اپنے اراکین کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے الازہر بھیجتی ہے اور سفید فام امریکیوں کے شانہ بشانہ ایک زیادہ منصفانہ معاشرے میں کام کرنے کے امکان کی جستجو کرتی ہے۔ شاید

''نیشن'' کی عجیب اور استرداد پسندانہ مثال اسلام کے حوالے سے مغرب کے اس یک رخے تصور (STEREOTYPE) پر پورا اترتی ہو کہ یہ ایک غیر روادار اور جنونی عقیدہ ہے۔

وہ مسلمان جو 1947ء میں پاکستان ہجرت نہیں کر گئے تھے اور ان کی اولادوں کی تعداد ہندوستان میں اب ساڑھے گیارہ کروڑ ہو گئی ہے۔ تاہم اپنی اتنی زیادہ تعداد کے باوجود بہت سے مسلمان مغرب میں موجود اپنے بھائیوں اور بہنوں کی نسبت خود کو زیادہ محصور اور خطرے میں تصور کرتے ہیں۔ 1947ء میں برصغیر کی تقسیم کے وقت ہونے والے المناک تشدد سے ہندوستان کے ہندو اور مسلمان اب بھی دہشت زدہ ہیں اور اگرچہ بہت سے ہندوؤں نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی ہے تاہم اب بھی ہندو مسلمانوں سے برا تاثر لیتے ہیں۔ انہیں علیحدگی پسندانہ ذہنیت کا الزام دیا جاتا ہے' انہیں الزام دیا جاتا ہے کہ وہ دل سے پاکستان یا کشمیر کے وفادار ہیں۔ انہیں اپنی پسماندگی پر بھی طعنے سننا پڑتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو بستیوں سے نکالا جا رہا ہے' وہ آسانی سے ملازمتیں حاصل نہیں کر سکتے اور ان کے مکانات بھی اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ شان و شوکت والے مغل ماضی کی واحد نشانیاں عظیم عمارتیں ہیں' یعنی تاج محل' لال قلعہ' جامع مسجد جو کہ ہندو بنیاد پرستوں کے گروہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کے جلوسوں کا بھی مرکز بن گئے ہیں' جس کا دعویٰ ہے کہ انہیں حقیقتاً ہندوؤں نے تعمیر کروایا تھا اور یہ کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں مندروں کو تباہ کروا کر ان کی جگہ مسجدیں بنوا دی تھیں۔ بی جے پی کا سب سے بڑا ہدف مغلیہ خاندان کے سربراہ بابر کی ایودھیا میں تعمیر کروائی ہوئی بابری مسجد بنی جسے انہوں نے دسمبر 1992ء میں پریس اور فوج کی موجودگی میں دس گھنٹوں میں منہدم کر دیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر اس کا تباہ کن اثر پڑا۔ انہیں خوف ہے کہ یہ علامتی تباہی تو آنے والی مصیبتوں کی فقط شروعات ہے اور جلد ہی وہ اور ان کی یادگاریں ہندوستان سے مٹا دیے جائیں گے۔ فنا کا یہی خوف ان کی ''شیطانی آیات'' کی مخالفت کے پیچھے کارفرما ہے جو کہ عقیدے کے لیے ایک اور خطرہ محسوس ہوتی تھی۔ اگرچہ فرقہ واریت اور عدم برداشت ہندوستانی اسلام کی سب سے زیادہ معتدل اور مہذبانہ روایتوں کے خلاف ہے۔ تاہم خوف اور جبر نے عقیدے کو مسخ کر دیا ہے۔

آئندہ کا راستہ

دوسری عیسوی ہزاری (Millenium) سے کچھ پہلے صلیبیوں نے یروشلم کے مقدس اسلامی شہر میں بسنے والے تیس ہزار کے لگ بھگ یہودیوں اور مسلمانوں کو قتل کر کے اسے ایک متعفن مردہ خانے میں بدل ڈالا۔ یروشلم وہ شہر تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ کے تینوں مذاہب کے ماننے والے پانچ سو سال سے مسلمانوں کی حکمرانی میں امن و ہم آہنگی کے ساتھ اکٹھے رہ رہے تھے اور آج وہی یروشلم لاشوں کے تعفن سے سڑ رہا تھا کیونکہ اس مہم کے بعد بچ رہنے والے صلیبیوں کی مختصر سی تعداد اس قابل نہیں تھی کہ وہ ان گنت لاشوں کو اٹھا سکتی۔ شہر کے اردگرد وادیاں اور کھائیاں کم از کم پانچ ماہ تک گلتی سڑتی ہوئی لاشوں سے اٹی رہیں۔ مسلمانوں کا یہ عیسائی مغرب کا پہلا تجربہ تھا' جو پانچویں صدی میں رومی سلطنت کے انہدام کے بعد طاری ہونے والے دور مظلمہ (Dark Ages) سے نکل کر خود کو دوبارہ بین الاقوامی منظر میں لا رہا تھا۔ مسلمانوں نے صلیبیوں (Crusaders) کے ہاتھوں مصیبتیں تو اٹھائیں تاہم وہ ان کی موجودگی کی وجہ سے زیادہ عرصہ تکلیف میں نہ رہے۔ 1187ء میں صلاح الدین ایوبی نے یروشلم پر دوبارہ اسلامی حکومت قائم کر دی اور اگرچہ صلیبی مزید ایک صدی مشرق قریب میں موجود رہے تاہم علاقے میں اسلام کی طویل تاریخ میں وہ ایک غیر اہم سرسری سا واقعہ لگتے تھے۔ اسلامی دنیا کے بیشتر باسی صلیبیوں سے غیر متاثر رہے اور انہیں مغربی یورپ سے دلچسپی بھی نہیں تھی' جو صلیبی جنگوں کے زمانے میں اپنے ثقافتی ارتقا کے باوجود ہنوز اسلامی دنیا کے پیچھے گھسٹ رہا تھا۔

تاہم یورپی صلیبی جنگوں (Crusades) کو نہیں بھولے نہ ہی وہ دارالاسلام کو

نظرانداز کرسکتے تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پوری دنیا پر حکومت قائم کرتا نظر آرہا تھا۔ مغربی عیسائی دنیا نے صلیبی جنگوں کے زمانے سے اسلام کا ایک یک رُخا اور مسخ تصور بنالیا تھا اور وہ اسے شائستہ تہذیب کا دشمن تصور کرتے تھے۔ یہ تعصب یہودیوں کے حوالے سے یورپیوں کی فنتاسیوں سے جڑ گیا تھا' جو کہ صلیبی جنگوں کا دوسرا نشانۂ ستم تھے اور اکثر و بیشتر عیسائیوں کے رویے کے حوالے سے ڈھکی چھپی پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر صلیبی جنگوں کے دوران' جب عیسائیوں نے اسلامی دنیا کے خلاف خونیں جنگوں کا سلسلہ شروع کردیا تھا' ایسا بھی ہوا کہ یورپ کے عالم فاضل مذہبی پیشواؤں نے اسلام کو ایک ایسا متشددانہ اور عدم رواداد عقیدہ قرار دیا' جو صرف تلوار کے بل پر برقرار تھا۔ مفروضہ جنونی اور عدم رواداراسلام مغرب کی ایک مسلمہ رائے بن گیا۔

تاہم ہزاری کے اختتام پذیر ہونے کے قریب ایسا لگتا تھا کہ کچھ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ مغرب والوں کے اس تصور کے مطابق جینے کا فیصلہ کرلیا ہے اور مقدس تشدد کو بنیادی اسلامی فریضہ بنالیا۔ یہ بنیاد پرست مغربی نوآبادتی نظام اور مابعد نوآبادیاتی مغربی استعماریت کو اکثر و بیشتر الصلیبیہ (صلیبی جنگ) قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نوآبادیاتی صلیبی جنگ اگرچہ کم متشددانہ رہی تاہم اس کے اثرات وسطی عہد کی مقدس جنگوں سے کہیں زیادہ تباہ کن تھے۔ طاقتور اسلامی دنیا گھٹ کر ایک طفیلی بلاک رہ گئی اور اسلامی معاشرہ ایک تیز رفتار جدیدیت پذیری کے پروگرام کی وجہ سے انتشار کا شکار ہوگیا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ساری دنیا میں تمام بڑے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ مغربی جدیدیت کے اثرات کی لپیٹ میں آگئے تھے اور ایسی جنگجویانہ اور عدم روادارانہ مذہبیت کو وضع کرچکے تھے جسے ہم بنیاد پرستی کہتے ہیں۔ اپنی سوچ کے مطابق جدید سیکولر ثقافت کے تخریبی اثرات کو دور کرنے کی جدوجہد کے دوران بنیاد پرستوں نے اسلام سمیت دنیا کے تمام مذاہب کی مشترکہ بنیادی اقدار رحمدلی' عدل وانصاف اور فیض رسانی کو ترک کردیا۔ ہر انسانی سرگرمی کی طرح مذہب بھی اکثر و بیشتر غلط استعمال ہوا ہے تاہم اپنی بہترین صورت میں یہ لوگوں میں انسانی جان کے تقدس کا شعور بیدار کرتا ہے اور جس ہلاکت انگیز تشدد کی طرف ہماری نوع المناک انداز میں مائل ہے اسے کم کرتا ہے۔ مذہب نے ماضی میں ظلم وستم کیا ہے تاہم سیکولرازم نے اپنی مختصر تاریخ میں یہ ثابت کردیا ہے کہ وہ بھی اتنا ہی متشددانہ ہوسکتا ہے' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اکثر و بیشتر سیکولر جارحیت اور ایذارسانی نے ہی مذہبی عدم رواداری اور نفرت میں اضافہ کیا ہے۔

یہ حقیقت 1992ء میں الجیریا میں المناک انداز میں واضح ہو چکی ہے۔ 1970ء کے عشرے میں ہونے والے مذہبی احیاء کے دوران اسلامی محاذِ آزادی (FIS) نے 1954ء میں فرانسیسی نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف انقلاب برپا کرنے اور 1962ء میں ملک میں سوشلسٹ حکومت قائم کرنے والے قومی محاذِ آزادی (NLF) کی اجارہ داری کو چیلنج کیا۔ فرانس کے خلاف الجیریا کا انقلاب یورپ سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرنے والے عربوں اور مسلمانوں کو تحریک (Inspiration) دیتا رہا تھا۔ این ایل ایف اس زمانے میں مشرق وسطیٰ میں قائم دوسری سیکولر اور سوشلسٹ حکومتوں سے مماثلت رکھتی تھی جنہوں نے اسلام کو ذاتی معاملہ قرار دے کر محدود کر دیا تھا۔ تاہم 1970ء کے عشرے تک پوری اسلامی دنیا کے عوام اپنے وعدے پورا نہ کرنے والے سیکولر نظریات سے غیر مطمئن ہو چکے تھے۔ ایف آئی ایس کے ایک بانی رکن عباس مدنی جدید دنیا کے لیے ایک اسلامی سیاسی نظریہ تخلیق کرنا چاہتے تھے۔ علی ابن حج (Ali Ibn Hajj) جو الجزائر میں ایک مسجد کے امام تھے' ایف آئی ایس کی ایک زیادہ انقلابی شاخ کی قیادت کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ایف آئی ایس نے حکومت سے اجازت لیے بغیر اپنی مسجدیں تعمیر کرنا شروع کر دیں۔ اس نے فرانس کی اسلامی برادری میں بھی اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا' جہاں محنت کش ژاں میری لی پین (Jean Marie Le Pen) کی قیادت میں کام کرنے والی دائیں بازو کی جماعت کی ناراضگی مول لیتے ہوئے کارخانوں اور دفتروں میں نماز کے لیے جگہوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔

1980ء تک الجیریا معاشی بحران کی لپیٹ میں آ گیا۔ این ایل ایف ملک کو جمہوریت اور ریاستیت (Statehood) کے راستے پر ڈال چکی تھی لیکن ملک بدعنوان ہو چکا تھا۔ پرانے لوگ زیادہ جمہوری اصلاحات کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ الجیریا کی آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کی تین کروڑ آبادی تیس برس سے کم عمر والوں کی تھی' جن میں سے اکثر لوگ بے روزگار تھے اور رہائشی سہولیات کا بھی فقدان تھا۔ فسادات معمول بن چکے تھے۔ این ایل ایف کی جامد اور بے محل پالیسیوں سے نوجوان مضطرب تھے۔ وہ کسی نئی شے کے خواہاں تھے اور اسلامی جماعتوں کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ جون 1990ء میں ایف آئی ایس نے مقامی انتخابات میں بڑی کامیابیاں' خصوصاً شہری علاقوں میں' حاصل کیں۔ ایف آئی ایس کے زیادہ تر کارکن نوجوان' مثالیہ پرست (Idealistic) اور تعلیم یافتہ تھے۔ گو کہ وہ کچھ شعبوں میں روایت پسند تھے مثلاً وہ عورتوں کو اسلامی لباس پہننے کی تاکید کرتے تھے لیکن

جاسکے۔ اب وہاں دہشت کا دور دورہ ہوگیا۔ این ایل ایف اور ایف آئی ایس دونوں تنظیموں میں مسئلے کے حل کے خواہاں عملیت پسندوں (Pragmatists) اور مذاکرات سے انکار کرنے والے سخت گیروں (Hardliners) کے مابین تقسیم رونما ہوگئی۔ انتخابات کو روکنے کے لیے لایا گیا ابتدائی انقلاب مذہبی اور سیکولر لوگوں کے درمیان مکمل جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جنوری 1995ء میں رومن کیتھولک چرچ نے دونوں گروپوں کو اکٹھا کرنے کے لیے روم میں اجلاس کا اہتمام کیا لیکن زیرول کی حکومت نے شرکت سے انکار کردیا۔ ایک سنہرا موقع گنوا دیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی دہشت گردی میں اضافہ ہوگیا اور ایک آئینی ریفرنڈم کے ذریعے تمام مذہبی سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا دی گئی۔

الجیریا جیسا المناک معاملہ مستقبل میں دہرایا نہیں جانا چاہیے۔ جبر و استبداد مسلمان اقلیت کو ایک ایسے تشدد پر مائل کردیتا ہے جو کہ اسلام کے ہر بنیادی عقیدے کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ جارحانہ سیکولرازم کا نتیجہ ایک ایسی مذہبیت کی صورت میں نکلتا ہے جو حقیقی عقیدے کی مسخ شدہ شکل ہوتی ہے۔ ایسے معاملات جمہوریت کو مزید داغدار بنا دیتے ہیں' جسے فروغ دینے کے لیے مغرب بہت بے تاب ہے لیکن ایسا ظاہر ہوا ہے کہ اگر جمہوری عمل ایک منتخب اسلامی حکومت کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہورہا ہو تو اس کو روک دیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لوگ اسلامی دنیا میں موجود مختلف جماعتوں اور گروپوں کے بارے میں لاعلم ثابت ہوئے ہیں۔ مغرب کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ اعتدال پسند ایف آئی ایس کو انتہائی متشددانہ بنیاد پرست گروپوں کے مساوی گردانتا ہے اور تشدد' غیر قانونیت اور جمہوریت دشمن رویے سے اس کا رشتہ جوڑتا ہے۔ یہ ذہنیت اس مرتبہ این ایل ایف کے سیکولرسٹوں میں ظاہر ہوئی ہے۔

تاہم مغرب اسے پسند کرے یا نہیں مقامی انتخابات میں ایف آئی ایس کی ابتدائی کامیابی ظاہر کرتی ہے کہ لوگ کسی نہ کسی شکل میں اسلامی حکومت کے خواہشمند ہیں۔ اس حقیقت نے مصر' مراکش اور تیونس کو ایک واضح پیغام بھیجا ہے' جہاں کی سیکولر حکومتیں اپنے اپنے ملکوں میں پنپنے والی مذہبیت سے طویل عرصے سے آگاہ ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں سیکولرازم غالب آ گیا اور اسلام کو چلا ہوا کارتوس سمجھ لیا گیا۔ اب مشرق وسطیٰ کی ہر سیکولر حکومت اس اذیت دہ صداقت سے آگاہ ہے کہ اگر حقیقی جمہوری انتخابات منعقد کروا دیئے جائیں تو اسلامی حکومت ضرور قائم ہوجائے گی۔ مثال کے طور پر مصر میں اسلام اسی طرح مقبول ہے جس طرح 1950ء کے عشرے میں ناصرازم مقبول تھا۔ اسلامی لباس عام ہو چکا ہے

ان کی حکومت دیانت دار اور اہل مشہور تھی۔ تاہم روایت پسند ہونے کے باوجود ایف آئی ایس مغرب دشمن نہیں تھی۔ اس کے رہنما یورپی یونین (European Union) کے ساتھ روابط قائم کرنے اور نئی مغربی سرمایہ کاری کی بات کرتے تھے۔ مقامی انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایسا لگتا تھا کہ وہ 1992ء میں ہونے والے قانون ساز انتخابات میں بھی یقینی طور پر کامیابی حاصل کرلیں گے۔

تاہم الجیریا میں کوئی اسلامی حکومت نہیں آنا تھی۔ فوج نے انقلاب برپا کردیا' این ایل ایف کے لبرل صدر بن جدید (Benjedid) کو اقتدار سے بے دخل کردیا گیا (جنہوں نے جمہوری اصلاحات کا وعدہ کیا تھا)' ایف آئی ایس پر پابندیاں لگا دی گئیں اور اس کے رہنماؤں کو قید کردیا گیا۔ اگر ایران اور پاکستان میں اس متشددانہ اور غیر آئینی طریقے سے انتخابات کو روکا جاتا۔ تو مغرب میں اس پر غلغلہ بپا ہوجاتا۔ ایسے انقلاب کو اسلام کی جمہوریت سے انحراف کی بیماری اور جدید دنیا کے ساتھ اس کی غیر ہم آہنگی تصور کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن چونکہ ایک اسلامی حکومت کو انقلاب کے ذریعے ختم کیا گیا تھا اس لیے مغربی پریس میں اس پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ الجیریا اسلامی خطرے سے بچ گیا تھا' الجزائر کے شراب خانے' جوأ خانے اور ڈسکو ناچ گھر محفوظ ہوگئے تھے اور کسی پراسرار طریقے سے اس غیر جمہوری اقدام نے الجیریا میں جمہوریت کو محفوظ کردیا تھا۔ فرانسیسی حکومت نے این ایل ایف کے نئے سخت گیر مؤقف کے حامل صدر لیامین زیرول (Liamine Zeroual) کی حمایت کی اور ایف آئی ایس کے ساتھ مزید مذاکرات نہ کرنے کے اس کے عہد کو استحکام عطا کیا۔ اس میں کوئی حیرت نہیں کہ اسلامی دنیا مغرب کے دہرے معیارات کی اس تازہ مثال پر صدمے کا شکار ہوئی۔

نتیجہ المناک انداز میں پیش گوئی کے قابل تھا۔ قانون کے جائز عمل سے نکال دیئے جانے پر ایف آئی ایس کے زیادہ ریڈیکل اراکین اس ناانصافی پر مشتعل اور مایوس ہوکر تنظیم سے الگ ہوگئے اور انہوں نے ایک گوریلا تنظیم "مسلح اسلامی گروپ" (GIA) بنالیا اور الجیریا کے جنوبی پہاڑی علاقے میں ایک دہشت گرد مہم شروع کردی۔ پوری پوری بستیوں کو قتل کردیا گیا۔ سیکولر نیز مذہبی صحافیوں اور دانشوروں کو نشانہ بنایا گیا۔ عمومی طور پر سوچا جاتا تھا کہ اسلام پسند ان سانحات کے ذمہ دار ہیں لیکن بتدریج ایسے سوالات پیدا ہونا شروع ہوگئے جو اس حقیقت کی نشاندہی کرتے تھے کہ الجیریائی افواج کے کچھ عناصر نہ صرف اس قتل عام کے انتظامات سے متفق تھے بلکہ غارت گری میں حصہ بھی لیتے تھے تاکہ جی آئی اے کو بدنام کیا

اور چونکہ مبارک حکومت سیکولر ہے لہٰذا واضح ہے کہ اسے رضا کارانہ طور پر اپنایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ سیکولر ترکی میں ہونے والے حالیہ انتخابات نے ظاہر کر دیا ہے کہ ستر فیصد عوام پختہ مسلمان ہیں جبکہ بیس فیصد دن میں پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ اردن میں لوگ اخوان المسلمون کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور فلسطینی جو پہلے پی ایل او سے وابستہ تھے اسے فرسودہ اور بدعنوان قرار دے کر مجامعہ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وسط ایشیا کی ریاستوں میں کئی عشروں تک سوویت غلبے تلے رہنے والے مسلمان اپنے مذہب کو دوبارہ اپنا رہے ہیں۔ لوگ مغربی ملکوں میں کامیاب ہونے والے سیکولر نظریات کو آزما چکے ہیں' جہاں پر وہ گویا اپنے گھر میں آزمائے گئے تھے جبکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اپنی حکومتوں سے چاہتے ہیں کہ وہ اسلام کے مزید قریب آ جائیں۔

واضح نہیں ہے کہ یہ رجحان کون سی درست صورت اختیار کرے گا۔ مصر میں ایسا لگتا ہے کہ لوگ شریعت کو ملک کے قانون کے طور پر دیکھنا پسند کریں گے جبکہ ترکی میں صرف تین فیصد لوگ شریعت کو ملک کا قانون بنانا چاہتے ہیں۔ تاہم مصر میں بھی کچھ علماء اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ شریعت کو' جو ایک زرعی قانونی ضابطہ ہے' جدیدیت کی مختلف صورتِ حالات کے مطابق ڈھالنا بہت مشکل ہوگا۔ رشید رضا 1930ء کے عشرے میں اس حقیقت سے آگاہ تھے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

یہ حقیقت نہیں ہے کہ مسلمان اب یکساں طور پر مغرب کی نفرت سے معمور ہو گئے ہیں۔ جدیدیت کے ابتدائی مراحل میں بہت سے ممتاز مفکرین یورپی ثقافت کے گرویدہ تھے اور بیسویں صدی کے اختتام تک چند انتہائی ممتاز اور بااثر مسلمان مفکرین دوبارہ مغرب سے فاصلے کم کر رہے تھے۔ ایران کے صدر خاتمی تو اس رجحان کی صرف ایک مثال ہیں۔ اسی طرح خمینی کی حکومت میں اہم عہدوں پر متمکن رہنے والے ایرانی دانش ور عبدالکریم سروش ہیں اور اگرچہ زیادہ روایت پرست مجتہدین نے اکثر و بیشتر انہیں سخت دق کیا تاہم وہ مقتدر افراد پر بھرپور اثرات ڈال رہے ہیں۔ سروش خمینی کی تعریف تو کرتے ہیں تاہم وہ ان سے آگے نکل چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب ایرانی تین قسم کے تشخص کے حامل ہیں: قبل از اسلامی' اسلامی اور مغربی جبکہ انہیں لازماً کسی ایک ہی تشخص کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سروش اس یقین کے ساتھ مغرب کے سیکولر ازم کو مسترد کرتے ہیں کہ انسان کو ہمیشہ روحانیت کی ضرورت رہے گی۔ تاہم وہ ایرانیوں کو شیعہ روایت پر عمل کرتے ہوئے جدید علوم (سائنسز) کا مطالعہ کرنے

کی تلقین کرتے ہیں۔ اسلام کو جدید صنعتی دنیا سے موافقت کے لیے لازماً اپنی فقہ تشکیل دینا ہوگی اور اکیسویں صدی میں جانے کے لیے شہری حقوق کا اپنا فلسفہ اور اقتصادی نظریہ وضع کرنا ہوگا۔

سُنّی مفکرین بھی ان سے ملتے جلتے نتائج پر پہنچ چکے ہیں۔ تیونس کی جلاوطن ''نشاۃ ثانیہ پارٹی'' کے رہنما راشد الغنوشی کو یقین ہے کہ اسلام سے مغرب کی دشمنی لاعلمی سے ابھری ہے۔ یہ عیسائیت کے برے تجربے سے بھی پیدا ہوئی ہے جس نے سوچ اور تخلیقیت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک جمہوری اسلام پسند قرار دیتے ہیں اور اسلام اور جمہوریت میں کوئی عدم موافقت نہیں پاتے تاہم وہ مغرب کے سیکولرازم کو رد کرتے ہیں کیونکہ انسانوں کو اس قدر تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کا نظریہ توحید روح اور جسم' عقلیت اور روحانیت' مرد اور عورت' اخلاقیات اور معیشت' مشرق اور مغرب میں ثنویت کو رد کرتا ہے۔ مسلمان جدیدیت کے خواہاں ہیں تاہم ایسی جدیدیت نہیں چاہتے جو امریکہ' برطانیہ یا فرانس ان پر مسلط کرے۔ مسلمان مغرب کی خوبصورت اور کارآمد ٹیکنالوجی کے معترف ہیں۔ وہ مغرب میں بغیر خون خرابے کے حکومت کی تبدیلی کے طریقے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ لیکن جب مسلمان مغربی معاشرے کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انہیں کوئی روشنی' کوئی جذبات اور کوئی روحانیت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنی مذہبی اور اخلاقی روایات اور مغربی تہذیب کے کچھ بہترین پہلوؤں کو ایک ساتھ اپنانا چاہتے ہیں۔ الازہر کے گریجویٹ اور ایک اخوان یوسف عبداللہ القرضاوی' جو قطر یونیورسٹی کے مرکز برائے سنت و سیرت کے ڈائریکٹر ہیں' اسی مؤقف کے حامل ہیں۔ وہ رواداری پر ایمان رکھتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ اسلامی دنیا میں حال ہی میں ابھرنے والا تعصب لوگوں کو دوسرے انسانوں کی بصیرتوں سے محروم کردے گا۔ حضرت محمد ﷺ نے کہا تھا کہ وہ مذہبی زندگی کا ایک ''درمیانی راستہ'' لے کر آئے ہیں جو انتہاؤں سے حذر کرتا ہے۔ قرضاوی کا خیال ہے کہ اسلامی دنیا کے کچھ حصوں میں ابھرنے والی حالیہ انتہاپسندی اسلامی روح کے منافی ہے اور باقی نہیں رہے گی۔ اسلام امن کا مذہب ہے جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے حدیبیہ میں قریش کے ساتھ معاہدہ کر کے ظاہر کیا تھا اور جسے قرآن ''ایک عظیم فتح'' کہتا ہے۔ 3 وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ مغرب کو مسلمانوں کے اپنے مذہب کے مطابق جینے کے حق کو تسلیم کرنا چاہیے اور اگر وہ پسند کریں تو اسلامی مثالیے کو اپنے نظام معاشرت و سیاست کا جزو بنالیں۔ انہیں اس حقیقت کو ماننا ہوگا کہ دنیا میں ایک سے زیادہ طرز حیات موجود ہیں۔

تنوع پوری دنیا کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ خدا نے انسانوں کو انتخاب کا حق اور صلاحیت دی ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ انسان ایک مذہبی طرز حیات کو منتخب کرلیں ـــ بشمول ایک اسلامی ریاست کے ـــ جبکہ دوسرے انسان سیکولر آدرش کو ترجیح دیں۔

قرضاوی کہتے ہیں: ''یہ مغرب کے لیے بہتر ہی ہے کہ مسلمان مذہبی ہوں' اپنے مذہب سے مخلص ہوں اور اچھے اخلاق والے بننے کی کوشش کریں۔'' 4۔ انہوں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا ہے۔ بہت سے مغربی لوگ بھی اپنی زندگیوں میں روحانیت کی عدم موجودگی سے بے آرامی محسوس کررہے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ لازماً جدیدیت سے پہلے کے مذہبی طرز حیات یا روایتی ادارہ جاتی مذہب کی طرف واپس ہوا جائے تاہم اس احساس میں اضافہ ہورہا ہے کہ اپنی بہترین صورت میں مذہب نے انسانوں کو شائستہ اقدار وضع کرنے میں مدد دی ہے۔ صدیوں سے اسلام نے معاشرتی انصاف' مساوات' اعتدال اور عملی ہمدردی جیسے تصورات کو اسلامی ضمیر میں نمایاں رکھا ہے۔ اگرچہ مسلمان ہمیشہ ان تصورات کے مطابق نہیں رہے اور انہیں ان کو اپنے معاشرتی اور سیاسی اداروں میں سمونے کے حوالے سے مسلسل دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے تاہم اس کے حصول کی جدوجہد صدیوں سے اسلامی روحانیت کا اصل محرک رہی ہے۔

مغربی لوگوں کو اس حقیقت سے لازماً آگاہ ہونا ہوگا کہ اسلام کی صحت اور مضبوطی اس کے اپنے مفاد میں بھی ہے۔ مغرب اسلام کی ان انتہاپسندانہ شکلوں کا مکمل ذمہ دار نہیں ہے' جو مذہب کے سب سے زیادہ مقدس عقائد کی پامالی کرنے والے تشدد کو روا رکھتی ہیں۔ تاہم اس صورتحال کے رونما ہونے میں مغرب کا بھی حصہ یقیناً ہے اور اس بنیاد پرستانہ وژن کی جڑوں میں مضمر خوف اور مایوسی و ناامیدی کو کم کرنے کے لیے تیسری عیسائی ہزاری میں اسلام کی زیادہ مناسب قدردانی کی جانی چاہیے۔

✿ ✿ ✿ ✿

اسلامی تاریخ کی اہم شخصیات

حضرت محمد ﷺ ابن عبداللہ (632ء۔570ء)

اللہ کے رسول ﷺ، جو مسلمانوں کے لیے قرآن لے کر آئے اور عرب میں توحیدی مذہب اور ایک نظام رائج کیا۔

حضرت اسمٰعیلؑ

اللہ کے نبی جنہیں بائبل میں اشائیل (Ishmael) کہا گیا ہے۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ انہوں نے اپنے والد حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ خانہ کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا۔

حضرت ابوبکرؓ

مشرف بہ اسلام ہونے والے اولین افراد میں سے ایک، پیغمبر خدا حضرت محمد ﷺ کے قریبی دوست، آپؓ حضرت محمد ﷺ کے وصال کے بعد پہلے خلیفہ بنے۔

حضرت عمرؓ ابن الخطاب

رسول خدا حضرت محمد ﷺ کے ایک قریب ترین رفیق۔ آپؓ رسول خدا ﷺ کے وصال کے بعد دوسرے خلیفہ بنے (44-634ء)۔ انہی کے دور میں عربوں نے فتوحات کیں نیز چھاؤنیاں تعمیر کی گئیں۔ انہیں ایک ایرانی جنگی قیدی نے شہید کر دیا۔

حضرت عثمانؓ ابن عفان

مشرف بہ اسلام ہونے والے اولین فرد اور رسول خدا حضرت محمد ﷺ کے داماد۔

آپؓ تیسرے خلیفہ بنے (56-644ء)۔آپؓ کو مدینہ میں شہید کردیا گیا۔

حضرت علیؓ

حضرت محمد ﷺ کے چچازاد بھائی اور داماد۔ آپؓ 656ء میں چوتھے خلیفہ بنے۔ 661ء میں ایک خارجی نے آپؓ کو شہید کردیا۔شیعوں کا ایمان ہے کہ آپؓ کو حضرت محمد ﷺ کا جانشین ہونا چاہیے تھا۔ وہ انہیں پہلا امام مانتے ہیں۔آپؓ کا روضہ عراق کے شہر نجف میں ہے۔

شاہ عباس اول (1629ء-1588ء)

ایران میں صفوی سلطنت کے دورِ عروج میں حکمران تھا۔ اصفہان میں اس کا دربار بہت عالیشان تھا۔ اس نے ایرانیوں کو بارہ امامی شیعیت کی تعلیم دینے کے لیے دوسرے ممالک سے علماء کو بلوایا۔

عبدالملک

اموی خلیفہ (705ء-685ء) اس نے خانہ جنگی کے بعد اموی اقتدار کو بحال کیا۔ گنبد صخریٰ اسی کے دور میں 691ء میں مکمل ہوا۔

محمد بن عبدالوہاب (92-1703ء)

ایک سُنّی مصلح جنہوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں کی طرف واپسی کے لیے جدوجہد کی۔ وہابیت اسلام کی وہ شکل ہے جس پر سعودی عرب میں عمل کیا جاتا ہے۔

محمد عبدہٗ (1905ء-1849ء)

ایک مصری مصلح جنہوں نے ملک کو متحد کرنے اور مسلمانوں کو نئے مغربی تصورات کے سمجھنے کا اہل بنانے کے لیے اسلامی اداروں کو جدید بنانے کی کوشش کی۔

ابوالفضل علامی (1602ء-1551ء)

صوفی مؤرخ اور مغل بادشاہ اکبر کا سوانح نگار۔

حضرت ابوسفیانؓ

ابوالحکم کے مرنے کے بعد رسول خدا حضرت محمد ﷺ کے مخالفوں کے قائد مگر بعد میں مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ وہ مکہ کے اموی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے حضرت معاویہؓ پہلے اموی خلیفہ بنے۔

احمد ابن حنبلؒ (855ء۔780ء)

محدث، فقیہہ اور اہل حدیث کی رہنما شخصیت۔ آپ فقہ کے حنبلی مکتب فکر کے بانی ہیں۔

احمد ابن ادریس (1836ء۔1760ء)

نئے صوفی (Neo-Sufi) مصلح۔ مراکش شمالی افریقہ اور یمن میں سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے علماء کو نظر انداز کر کے عوام تک اسلام کی زیادہ جاندار شکل کو براہ راست پہنچانے کی کوشش کی۔

سر سید احمد خان (1817-98ء)

ایک ہندوستانی مصلح، جنہوں نے اسلام کو جدید مغربی لبرل ازم سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے ہندوستانیوں کو یورپیوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور ان کے اداروں کو قبول کرنے کی تاکید کی۔

احمد سرہندیؒ (وفات 1625ء)

صوفی مصلح جنہوں نے مغل شہنشاہ اکبر کی تکثیریت کی مخالفت کی۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ

ام المومنین۔ آپؓ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی تھیں۔

عبدالحمید

عثمانی سلطان (1839-61ء)، جس نے مطلق اقتدار میں بہتری اور حکومت کو عثمانی رعایا کی رائے کا تابع بنانے کے لیے گولہین فرمان جاری کیا۔

اکبر

ہندوستان کا مغل بادشاہ (1605ء-1560ء) ۔ اس نے ہندو رعایا کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ایک اعتدال پسندانہ پالیسی اختیار کی۔ اس کے دور میں مغل اقتدار اپنے عروج کو پہنچ گیا۔

ابوالحکم

(قرآن میں اسے ابوجہل کہا گیا ہے): اس نے مکہ میں حضرت محمد ﷺ کے مخالفوں کی قیادت کی تھی۔

امام ابوحنیفہ (767ء-699ء)

فقہ کے رائد (Pioneer) اور حنفی مکتبِ فکر کے بانی۔

امام علی الہادی

شیعوں کے دسویں امام۔ 848ء میں خلیفہ المتوکل نے آپ کو سامرہ بلا بھیجا اور وہاں گھر میں نظر بند کر دیا۔ آپ نے عسکری قلعہ میں 868ء کو وفات پائی۔

امام علی الرضا

شیعوں کے آٹھویں امام۔ خلیفہ مامون نے اپنی سلطنت کے ناخوش شیعوں کو راضی کرنے کے لیے انہیں 817ء میں اپنا جانشین نامزد کیا تھا مگر یہ ایک نامقبول اقدام تھا جبکہ اگلے ہی برس امام الرضا فوت ہو گئے۔ امکان ہے کہ انہیں قتل کیا گیا تھا۔

امام علی زین العابدین (وفات 714ء)

شیعوں کے چوتھے امام۔ وہ مدینہ میں مقیم رہے اور سیاست میں عملی حصہ نہیں لیا۔

آقا محمد خان (وفات 1797ء)

ایران میں قاچار سلطنت کے بانی۔

اورنگ زیب

مغل شہنشاہ (1707ء۔ 1658ء) اس نے اکبر کی روادارانہ پالیسیوں کو ختم کر دیا اور ہندو اور سکھ بغاوتوں کا باعث بنا۔

رکن الدین بیبرس (وفات 1227ء)

مملوک سلطان۔ اس نے شمالی فلسطین میں عین جالوت کے مقام پر منگولوں کو شکست دی اور شامی ساحل پر واقع آخری صلیبیوں کے مضبوط مراکز کو مٹا دیا۔

حسن البنا (49-1906ء)

ایک مصری مصلح اور اخوان المسلمون کے بانی۔ انہیں 1949ء میں مصر کی سیکولر حکومت نے قتل کروا دیا۔

ذوالفقار علی بھٹو

پاکستان کے وزیراعظم (79-1971ء) جنہوں نے اسلام پسندوں کو رعایتیں دینے کی کوششیں کیں مگر راسخ العقیدہ جنرل محمد ضیاء الحق نے ان کا تختہ الٹ دیا۔

بایزید بسطامی (وفات 874ء)

اولین وحدت الوجودی صوفی جنہوں نے فنا فی اللہ کے فلسفے کا پرچار کیا اور گہری صوفیانہ ریاضتوں کے بعد الوہی ہستی کو اپنے اندر دریافت کیا۔

امام بخاری (وفات 870ء)

احادیث کے مستند ترین مجموعے کے مرتب۔

ابوالسند خولہ چیلیپی (1574ء۔ 1490ء)

انہوں نے شرعی عثمانی سلطنت کے قانونی اصول وضع کیے۔

ابونصر الفارابی (وفات 950ء)

تمام فیلسوفوں میں سب سے زیادہ عقلیت پسند' جو ایک عملی صوفی بھی تھے۔ وہ حلب میں ہمدانی دربار میں درباری موسیقار بھی رہے۔

راشد الغنوشی ۔(1941ء)

تیونس کی جلاوطن نشاۃ ثانیہ پارٹی کے قائد' جو اپنے آپ کو "جمہوری اسلام پسند" قرار دیتے ہیں۔

ابو محمد حامد الغزالی (وفات 1111ء)

بغداد کے الٰہیات دان جنہوں نے سُنّی اسلام کی تشریح و تعبیر کی اور تصوف کو مرکزی دھارے میں لائے۔

بی بی ہاجرہؑ

بائبل کے مطابق آپ حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ اور حضرت اشمائیل (Ishmael) (عربی میں حضرت اسمٰعیلؑ) کی والدہ تھیں۔ عرب حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا بی بی ہاجرہؑ کا اسلام کی انتہائی محترم ہستی کے طور پر احترام کیا جاتا ہے اور حج کے دوران ان کے ساتھ خصوصی عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ضیاء الحق

پاکستان کے صدر (88-1977ء) انہوں نے زیادہ اسلامی حکومت قائم کی۔ تاہم سیاسی اور معاشی پالیسیوں کو مذہب سے الگ رکھا۔

حضرت حسنؓ ابن علیؓ (وفات 660ء)

حضرت علیؓ کے فرزند اور رسول خدا حضرت محمد ﷺ کے نواسے۔ شیعہ انہیں اپنا دوسرا امام مانتے ہیں۔ شیعوں کا دعویٰ تھا کہ اپنے والد کی شہادت کے بعد وہ خلیفہ ہیں۔ تاہم حضرت حسنؓ سیاست سے الگ ہونے پر راضی ہوگئے اور مدینہ میں خاموشی سے زندگی گزاری۔

حسن الاشعری (وفات 935ء)

معتزلہ اور اہل حدیث میں موافقت پیدا کروانے والے فلسفی۔ ان کا جوہری فلسفہ سُنّی عقاید کی روحانیت کا بنیادی اظہار بن گیا۔

امام حسن العسکری (وفات 874ء)

شیعوں کے گیارہویں امام۔ جو سامرہ کے عسکری قلعے میں عباسی خلفاء کے قیدی کے طور پر رہے اور وہیں وفات پائی۔ بیشتر اماموں کی طرح یقین کیا جاتا ہے کہ انہیں بھی عباسیوں نے زہر دلوا کر شہید کروایا تھا۔

حسن بصریؒ (وفات 728ء)

بصرہ کے مبلغ اور مذہبی اصلاح کے قائد۔ وہ اموی خلفاء پر کھلے عام تنقید کیا کرتے تھے۔

حضرت حسینؓ

حضرت علیؓ کے دوسرے فرزند اور رسول خدا حضرت محمد ﷺ کے نواسے۔ شیعہ انہیں تیسرا امام مانتے ہیں اور ہر سال محرم کے مہینے میں یزید کے ہاتھوں آپ کی شہادت کا سوگ مناتے ہیں۔

معید الدین ابن العربی (وفات 1240ء)

ہسپانوی صوفی اور فلسفی۔ جنہوں نے اسلامی سلطنت کی خوب سیاحت کی۔ وہ انتہائی اثر انگیز مصنف تھے۔ انہوں نے ایک تکثیری الٰہیاتی وژن کا پرچار کیا۔ روحانیت ان کے فلسفے میں سموئی ہوئی ہے۔

ابن حزم (1064ء۔994ء)

قرطبہ کے دربار کا ایک ہسپانوی شاعر اور مذہبی مفکر۔

محمد ابن اسحٰق (وفات 767ء)

رسول خدا حضرت محمد ﷺ کے پہلے اہم سیرت نگار۔ انہوں نے احادیث کو بنیاد بنا کر بہت احتیاط سے آپ ؐ کی سوانح لکھی تھی۔

عبدالرحمٰن ابن خلدون (1406ء۔1332ء)

''المقدمہ'' کے مصنف۔ ایک فیلسوف جنہوں نے فلسفے کے اصولوں کا اطلاق مطالعہ تاریخ پر کیا اور واقعات کے بہاؤ کے پس پردہ آفاقی قوانین ڈھونڈے۔

ابوالولید احمد ابن رُشد (98-1126ء)

ایک فیلسوف اور قرطبہ کے قاضی۔ انہیں مغرب میں Averroes کہا جاتا ہے۔ ان کے عقلیت پسندانہ فلسفے نے اسلامی دنیا سے زیادہ مغرب کو متاثر کیا۔

بوعلی سینا (1037ء۔980ء)

انہیں مغرب میں Avicenna کہا جاتا ہے۔

ابن تیمیہ ؒ (1328ء۔1263ء)

ایک مصلح جنہوں نے تصوف کے اثرات کو ختم کرنے اور قرآن وسنت کے بنیادی اصولوں کی طرف واپسی کی کوشش کی۔ وہ دمشق میں قید کے دوران فوت ہوئے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ (وفات 629ء)

دوسرے فتنے کے دوران امویوں کے سب سے بڑے مخالف۔

علامہ محمد اقبال ؒ (1938ء۔1876ء)

ہندوستانی شاعر اور فلسفی، جنہوں نے مغربی جدیدیت سے ہم آہنگ ثابت کرنے کے لیے اسلام کی عقلیت پسندی پر زور دیا۔

ابوالقاسم محمد

یہ امام غائب کے نام سے بھی معروف ہیں۔ آپ شیعوں کے بارہویں امام تھے، جو

کہا جاتا ہے کہ 874ء میں اپنی جان بچانے کے لیے عالم غیب میں چلے گئے تھے۔ 934ء میں ان کی ''غیبت'' کا اعلان کردیا گیا۔ کہا گیا کہ خدا نے معجزانہ طور پر امام کو محفوظ کرلیا ہے اور وہ شیعوں سے مزید براہ راست رابطہ نہیں کرسکتے۔ قیامت سے تھوڑا پہلے وہ مہدی کی حیثیت سے واپس تشریف لائیں گے اور عدل اور امن کے سنہرے دور کو رائج کریں گے اور خدا کے دشمنوں کو برباد کردیں گے۔

حضرت اسمٰعیل ابن جعفر

آپ کو آپ کے والد حضرت جعفر الصادق نے شیعوں کا ساتواں امام بنایا تھا۔ کچھ شیعہ (جنہیں اسماعیلی کہا جاتا ہے) یہ ایمان رکھتے ہیں کہ آپ حضرت علیؓ کی آخری حقیقی اولاد ہیں اور امامت کے حق دار۔ اسمٰعیلی حضرت موسیٰ الکاظم کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے جو حضرت جعفر الصادق کے چھوٹے بیٹے تھے اور جنہیں بارہ اماموں کو ماننے والے شیعہ ساتواں امام مانتے ہیں۔

اسمٰعیل پاشا

وہ مصر کا گورنر بنا۔ (79-1863ء) اور اسے خدیو کا خطاب دیا گیا۔ اس کے جدیدیت پذیری کے پروگرام نے ملک کو دیوالیہ کردیا اور مصر پر برطانوی تسلط کا باعث بنا۔

شاہ اسمٰعیل (1524ء۔ 1487ء)

ایران کا پہلا صفوی بادشاہ۔ جس نے ملک میں شیعیت کو رائج کیا۔

امام جعفر الصادق (وفات 765ء)

شیعوں کے چھٹے امام' جنہوں نے امامت کا نظریہ تشکیل دیا اور اپنے پیروکاروں کو تاکید کی کہ سیاست سے دستبردار ہوکر قرآن پر غور وفکر کریں۔

جمال الدین افغانی (97-1837ء)

ایک ایرانی مصلح جنہوں نے مسلمانوں کو متحد ہوجانے کی تلقین کی اور یورپ کے تسلط سے بچنے کے لیے اسلام کو جدید بنانے کی کوشش کی۔

محمد علی جناحؒ (1948ء۔1876ء)

ہندوستان کی تقسیم کے زمانے میں مسلم لیگ کے قائد۔ آپ پاکستان کے بانی تھے۔

جنید بغدادیؒ (وفات 910ء)

آپ پہلے صوفی تھے جنہوں نے وحدت الوجودی صوفیوں کی کیفیت کو محض ایک ایسا مرحلہ قرار دیا جسے سچے صوفی کو لازماً عبور کر جانا چاہیے۔

ام المومنین حضرت خدیجہؓ

رسول خدا حضرت محمد ﷺ کی پہلی زوجہ اور آپ ﷺ کے حیات رہ جانے والے تمام بچوں کی والدۂ محترمہ۔ آپؓ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور مکہ میں ہجرت سے پہلے وصال فرمایا۔

محمد ایوب خان

پاکستان کے صدر (69-1958ء) انہوں نے ایک بھرپور سیکولر پالیسی اختیار کی جو ان کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

حجۃ الاسلام سید خاتمی

ایران کے صدر (1997ء) ۔ وہ ایران میں اسلامی قانون کی زیادہ لبرل تعبیر چاہتے ہیں اور مغرب سے تعلقات قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔

آیت اللہ روح اللہ خمینی (89-1902ء)

پہلوی شہنشاہی کے خلاف اسلامی انقلاب کے روحانی قائد اور ایران کے اعلیٰ ترین فقیہہ (89-1970ء)

یعقوب ابن اسحٰق الکندی (وفات 870ء)

پہلے اہم فیلسوف جنہوں نے بغداد میں معتزلہ کے دوش بدوش کام کیا مگر یونانی داناؤں سے بھی حکمت حاصل کی۔

آ قا خان کرمانی (96-1853ء)

ایک ایرانی سیکولر مصلح۔

خلیفہ المہدی

عباسی خلیفہ (85-775ء) جس نے زیادہ مذہبی مسلمانوں کو عزت و احترام بخشا‘ فقہ کے مطالعے کی حوصلہ افزائی کی اور حکومت میں مذہبی لوگوں کا اثر ورسوخ بڑھایا۔

محمود دوم

عثمانی سلطان (39-1808ء) جس نے جدیدیت رائج کرنے کے لیے ’’تنظیمات‘‘ کے نام اصلاحات کیں۔

محمد باقر مجلسی (وفات 1700ء)

شیعیت کے ایران کا حکومتی مذہب بن جانے کے بعد محمد باقر مجلسی نے سخت اقدامات کیے۔ فلسفہ کی تعلیمات کو دبایا اور صوفیوں کو سزائیں دیں۔

میلکم ایکس (65-1925ء)

سیاہ فام علیحدگی پسند گروپ ’’نیشن آف اسلام‘‘ کے کرشماتی رہنما جنہوں نے شہری حقوق کی تحریک کے دوران امریکہ میں بڑی قدر و منزلت حاصل کی۔ 1963ء میں وہ بدعتی تنظیم ’’نیشن آف اسلام‘‘ سے اپنے پیروکاروں کو نکال لے گئے اور سنی اسلام کے مرکزی دھارے میں شامل ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں دو سال بعد انہیں قتل کر دیا گیا۔

امام مالک ابن انسؒ (وفات 795ء)

فقہ کے مالکی مکتبِ فکر کے بانی۔

خلیفہ المامون

عباسی خلیفہ (33-813ء) اس کے عہدِ اقتدار سے عباسیوں کے زوال کا آغاز ہوا۔

خلیفہ المنصور

عباسی خلیفہ (75-754ء)۔ اس نے شیعوں پر سختیاں کیں اور سلطنت کا دارالخلافہ نئے شہر بغداد میں منتقل کر دیا۔

حسین المنصور

انہیں الحلاج بھی کہا جاتا ہے۔ وحدت الوجودی صوفیا میں سے سب سے زیادہ مشہور صوفی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عالم کیف میں نعرہ لگایا تھا ''اناالحق''۔ انہیں بدعت کرنے کے الزام میں 922ء کو سزائے موت دے دی گئی۔

ابوالاعلیٰ مودودی (79-1903ء)

ایک پاکستانی بنیاد پرست نظریہ ساز، جن کے نظریات سُنّی دنیا میں بہت اثر آفریں رہے ہیں۔

محمد دوم

عثمانی سلطان (61-1451ء) اسے ''فاتح'' کے لقب سے جانا جاتا ہے کیونکہ اس نے 1453ء میں بازنطینی قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا۔

میر دیمد (وفات 1631ء)

اصفہان میں باطنی فلسفے کے مکتب کا بانی اور ملا صدرا کا استاد۔

حضرت معاویہؓ ابن ابی سفیانؓ

پہلے اموی خلیفہ جنہوں نے 661ء سے 680ء تک حکومت کی اور پہلے فتنے کے بعد مسلمانوں کے لیے مضبوط اور مؤثر حکومت قائم کی۔

آیت اللہ حسن مدرسی (وفات 1973ء)

ایک ایرانی مذہبی پیشوا جنہوں نے مجلس میں رضا شاہ پر تنقید کی اور حکومت نے انہیں قتل کروا دیا۔

محمد علی پاشا (1849ء۔1769ء)

عثمانی فوج کا ایک البانوی افسر جس نے مصر کو استنبول سے حقیقتاً آزاد کر دیا اور ملک کو جدید بنایا۔

محمد ابن علی السنوسی (وفات 1832ء)

نئے صوفی (Neo-Sufi) مصلح جنہوں نے سنوسیہ تحریک کی بنیاد رکھی جو اب بھی لیبیا میں حاوی ہے۔

محمد الباقر (وفات 735ء)

شیعوں کے پانچویں امام۔ وہ مدینہ میں قیام پذیر رہے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قرآن کے باطنی مطالعے کا طریقہ وضع کیا جو کہ بارہ اماموں کو ماننے والے شیعوں کا خاصہ تھا۔

محمد خوارزم شاہ

خوارزم کا حکمران (1200-20ء)، جس نے ایران میں ایک مضبوط بادشاہت قائم کرنے کی کوشش کی مگر اس نے منگولوں کے اشتعال کو بھڑکا دیا اور اس طرح ان کے پہلے حملے کا محرک ثابت ہوا۔

محمد رضا شاہ پہلوی

ایران کا دوسرا پہلوی بادشاہ (79-1944ء) جس کی سیکولرازم اور جدیدیت کو رائج کرنے کی جارحانہ کوششیں اسلامی انقلاب کا باعث بنیں۔

مرزا ملکوم خان (1908ء۔1838ء)

ایرانی سیکولر مصلح۔

مُلّا صدرا (وفات 1640ء)

شیعہ باطنی فلسفی، جن کی تحریریں ایران میں خصوصاً دانشوروں، انقلابیوں اور جدیدیت پسندوں کے لیے محرک ثابت ہوئیں۔

مراد اول

عثمانی سلطان (89-1360ء) جس نے کوسووفیلڈ کی جنگ میں سربوں کو شکست دی۔

امام مسلمؒ (وفات 878ء)

احادیث کے ایک مستند مجموعے کے مرتب۔

مصطفیٰ کمال اتاترک (1938ء۔1881ء)

جدید سیکولر ترکی کے بانی۔

خلیفہ المتوکل

عباسی خلیفہ (61-847ء) جس کو سامرہ کے عسکری قلعے میں شیعوں کے اماموں کو قید کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

نادر خان (وفات 1748ء)

اس نے صفوی سلطنت کے زوال کے بعد شیعہ ایران کو عارضی طور پر بحال کیا تھا۔

شیخ محمد حسین نائینی (1850ء۔1936ء)

ایک ایرانی مجتہد' جن کی کتاب ''قوم کو نصیحت'' آئینی حکومت کی مضبوط شیعی تائید فراہم کرتی ہے۔

خلیفہ الناصر

آخری عباسی خلفا میں سے ایک' جس نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے بغداد کے اسلامی اداروں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔

جمال عبدالناصر

مصر کا صدر (70-1952ء) وہ ایک عسکریت پسندانہ قوم پرست' سیکولر اور سوشلسٹ حکومت کا سربراہ تھا۔

نظام الملک

ذہین و فطین ایرانی وزیر' جس نے 1063ء سے 1092ء تک سلجوقی سلطنت پر حکومت کی۔

سید قطب (66-1906ء)

ایک اخوان جنہیں ناصر حکومت نے سزائے موت دی۔ان کا فلسفہ تمام سُنّی بنیاد پرستوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید

عباسی خلیفہ (789ء۔809ء)' اس کے عہد میں خلیفہ کا مطلق اقتدار عروج کو پہنچ گیا۔اس کے عہد میں شاندار ثقافتی کارنامے انجام دیئے گئے۔

رضا خان

ایران کا بادشاہ (41-1921ء) اور پہلوی سلطنت کا بانی۔ اس کی حکومت جارحانہ حد تک سیکولر اور قوم پرست تھی۔

محمد رشید رضا (1935ء۔1865):

یہ صحافی تھے۔ انہوں نے قاہرہ میں سلفیہ تحریک کی بنیاد رکھی۔ وہ مکمل طور پر جدید اسلامی ریاست کے پہلے وکیل تھے۔

جلال الدین رومیؒ (75-1207ء)

ایک نہایت بااثر صوفی جنہوں نے مولویہ سلسلے کی بنیاد رکھی' ان کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنہیں ''رقصاں درویش'' کہا جاتا ہے۔

صلاح الدین یوسف ابن ایوب (وفات 1193ء)

کرد جرنیل جو شام اور مصر پر محیط وسیع سلطنت کا سلطان بنا۔ فاطمی خلافت کو شکست دینے کے بعد مصر کو دوبارہ سُنّی اسلام کی طرف لایا اور یروشلم سے صلیبیوں کو نکال باہر کیا۔ صلاح الدین (جو مغرب میں Saladin مشہور ہے) ایوبی سلطنت کا بانی تھا۔

سلیم اول

عثمانی سلطان (20-1512ء)' جس نے شام' فلسطین اور مصر کو مملوکوں سے حاصل کر لیا۔

سلیم سوم

عثمانی سلطان (1807ء۔1789ء)' اس نے سلطنت میں مغربیت کو رواج دینے کے لیے اصلاحات کی کوشش کی۔

امام محمد ادریس الشافعیؒ (وفات 820ء)

انہوں نے اسلامی قانون کے ''اصول'' وضع کر کے فقہ کے مطالعہ میں انقلاب برپا

کردیا۔ آپ فقہ کے شافعی مکتب فکر کے بانی تھے۔

شاہ جہاں

مغل شہنشاہ (58-1627ء) جس کے عہد میں مغلیہ نفاست اور سلیقہ عروج کو پہنچ گیا۔ اس نے تاج محل تعمیر کروایا۔

شاہ ولی اللہ (62-1703ء)

ہندوستان کے ایک صوفی مصلح جنہوں نے سب سے پہلے مغربی جدیدیت سے اسلام کو لاحق ہونے والے خطرات کو بھانپ لیا تھا۔

سنان پاشا (وفات 1578ء)

استنبول کی سلیمانیہ مسجد اور ایڈرین ایڈریانوپل کی سلیمی مسجد کا معمار۔

عبدالکریم سروش (1945ء)

ممتاز ایرانی دانشور، جو مغربی سیکولرازم کو رد کرتے ہوئے شیعیت کی ایک زیادہ لبرل تعبیر کی وکالت کرتے ہیں۔

یحییٰ سہروردی (وفات 1191ء)

صوفی فلسفی، اشراق کے مکتبِ فکر کے بانی، جس کی بنیاد اسلام سے پہلے کی ایرانی باطنیت ہے۔ انہیں مبینہ بدعتی عقائد کی بنا پر ایوبی حکومت نے حلب میں سزائے موت دے دی۔

سلیمان اول

عثمانی سلطان (66-1520ء) ''یہ القانونی'' کے لقب سے مشہور ہے یعنی اسلامی دنیا کو قانون دینے والا نیز مغرب میں ''عالی شان'' کے لقب سے مشہور ہے۔ اس نے سلطنت کے ممتاز اداروں کو وضع کیا جو اس کے عہد میں اپنے اختیار کی تکمیل کو پہنچے۔

ابو جعفر طبری (وفات 923ء)

شریعت کے ایک عالم اور مؤرخ، جنہوں نے ایک عالمی تاریخ لکھی جس میں مختلف برادریوں (Communities) کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے اور امت مسلمہ کا خصوصی مطالعہ کیا گیا ہے۔

رفاح التحتوی (73-1801ء)

ایک مصری عالم جنہوں نے اپنی مطبوعہ ڈائری میں یورپ کی جذباتی تعریف کی ہے۔ انہوں نے یورپی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور مصر میں جدیدیت پذیری کے تصور کو فروغ دیا۔

عمر دوم

ایک اموی خلیفہ (20-717ء)، جنہوں نے مذہبی تحریک کے اصولوں کے مطابق حکومت کرنے کی کوشش کی۔ وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے اپنی سلطنت کی رعایا کے اسلام قبول کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔

خلیفہ الولید اول

ایک اموی خلیفہ (17-705ء)، جس نے اموی قوت و اقتدار اور کامیابی کے عروج کے دوران حکومت کی۔

واصل ابن عطا (وفات 748ء)

عقلیت پسندانہ الٰہیات کے معتزلہ مکتب کے بانی۔

شیخ احمد یاسین (1936ء)

اسرائیلی مقبوضہ غزہ میں ''مجامعہ'' (اسلامی کانگرس) کے بانی۔ یہ ایک فلاحی تنظیم ہے۔ دہشت گرد گروپ حماس اسی سے الگ ہو کر وجود میں آیا تھا۔

یزید اول

اموی خلیفہ (83-680ء) جسے بنیادی طور پر کربلا میں حضرت حسینؓ کو شہید کروانے کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔

زید ابن علیؓ (وفات 740ء)

شیعوں کے پانچویں امام کے بھائی۔ ان کی امامت کو ماننے والے شیعوں کو ''زیدیہ'' کہا جاتا ہے۔

✿ ✿ ✿ ✿

حواشی

شروعات

١ جلال الدین سیوطیؒ الاتقان فی علوم القرآن بحوالہ ''محمد ﷺ'' از میکسم روڈنسن (ترجمہ: این کارٹر' لندن' 1971ء) 74۔

٢ محمد ابن اسحٰق (سیرتِ رسول اللہ ﷺ (ترجمہ و ادارت اے گیلام ''دی لائف آف محمد ﷺ'' لندن' 1955ء) 158۔

٣ قرآن 25:3' 29:17' 44:47' 69:44۔ قرآن کے تمام حوالے ''دی میسج آف دی قرآن'' مترجم محمد اسد' جبرالٹر' 1980ء سے لیے گئے ہیں۔

٤ قرآن 80:11

٥ قرآن 2:129-32' 61:6

٦ قرآن 2:256

٧ قرآن 29:46

٨ قرآن 8-10' 74:1-5' 88:21-2۔

٩ قرآن 33:35

١٠ قرآن 4:3

۱۱ کتابِ پیدائش 16، 18:18-20

۱۲ D.Sidersky, Les Origenes dans legendes musulmans dans le Coran et dans les vies des prophetes (Paris, 1933).

۱۳ قرآن 2:129-32، 3:58-62، 2:39

۱۴ قرآن 6:159, 161-2

۱۵ قرآن 8:16-17

۱۶ قرآن 2:194,252، 5:65، 22:40-42

ارتقا

-1 قرآن 49:12

-2 قرآن 9:106-7

-3 اولین شیعوں کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ ہم یقینی طور پر نہیں جانتے کہ حضرت علیؑ کی مرد اولاد کو باطنیت کا میلان رکھنے والے شیعوں کے گروہ نے حقیقت میں امام تسلیم کیا تھا یا ان کی نسل کے معدوم ہو جانے کے بعد اور جب بارہ اماموں کو ماننے والے شیعوں نے متعین شکل اختیار کرلی تب اس تاریخ کو اولین اماموں تک تشکیل دے دیا گیا۔

-4 قرآن 2:234، 8:2، 23:57-61

-5 اسمٰعیلیوں کے آغاز کے بارے میں کچھ واضح نہیں ہے۔ ممکن ہے امام اسمٰعیل سے وفاداری کی کہانی بارہ اماموں کو ماننے والے شیعوں کی الٰہیات کے وضع ہونے کے بعد اسمٰعیلی مؤقف کو جواز مہیا کرنے کے لیے تخلیق کی گئی ہو۔ ممکن ہے اسمٰعیلی، جو عموماً سیاسی اعتبار سے متحرک تھے، اصلاً ''زیدیہ'' ہوں یعنی وہ شیعہ جو پانچویں امام کے بھائی حضرت زید بن علی کے پیروکار تھے اور ان کا ایمان تھا کہ غیر منصفانہ حکومت کے خلاف مسلح بغاوت مسلمانوں پر فرض ہے۔

عروج

1- قاہرہ کی اسمٰعیلی سلطنت کو اکثر و بیشتر ''فاطمی'' سلطنت کہا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بارہ اماموں کو ماننے والے شیعوں کی طرح اسمٰعیلی بھی ان اماموں کو مانتے ہیں جو حضرت علیؓ اور رسول خدا کی بیٹی حضرت فاطمہؓ کی حقیقی اولاد ہیں۔

2- قرآن 2:109

3- المقدمہ' (بحوالہ ''اسلامک فنڈامنٹل ازم'' از یوسف ایم شعوری' لندن' 1990ء) 18۔

الم زدہ اسلام

1- ولایتِ فقیہہ کے نظریے پر فقہا نے پہلے بھی بحث کی تھی تاہم یہ زیادہ مشہور نہیں تھا اور اسے ہمیشہ انحرافی بلکہ بدعتی نظریہ تصور کیا جاتا تھا۔ خمینی نے اسے اپنی سیاسی فکر میں مرکزی اہمیت دی اور بعد میں یہ نظریہ ایران میں ان کے اقتدار کی بنیاد بنا۔

2- قرآن 2:178' 8:68' 24:34' 47:5۔

3- قرآن 48:1

4- ''جہاد اور سلام کے درمیان: اسلامی تصورات'' از جوائس ایم۔ڈیوس (نیویارک' 1997ء)' 231۔